افسانے اور ڈرامے

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو
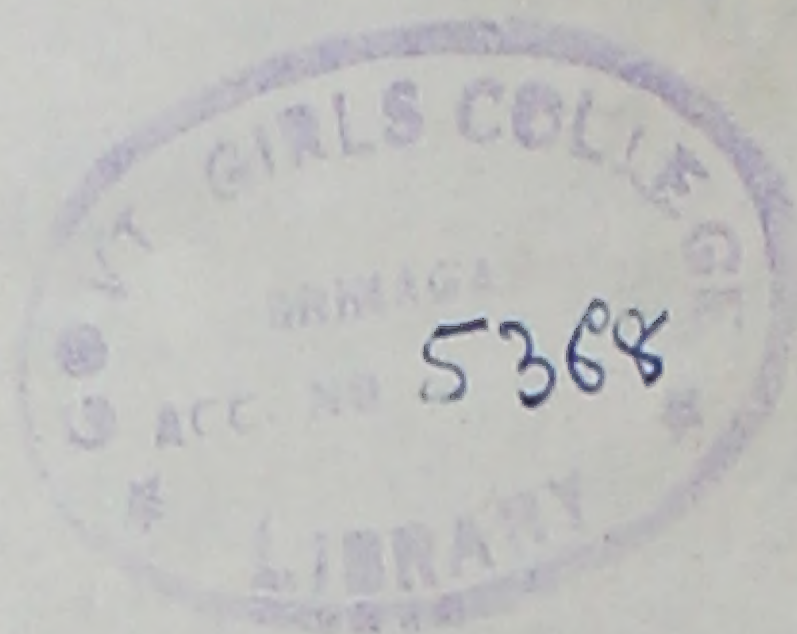
بلاؤز

قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے کبھی ہولے ہولے وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہئے۔ انہیں جلدی طے کرجانا چاہئے یا کچھ وقت لیکر آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی چیزوں کا سہارا لیکر طے کرنا چاہئے مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا وہ بےحد مضطرب تھا۔ اسی اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیرارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اسکے ساتھ لٹک جاتا پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اسکے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوتی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو۔۔۔ کیا ہو؟۔۔۔ بس کچھ ہو میز پر قرینے سے چنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کردیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھوٹ نکلے اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔۔۔ کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا

رضیہ نئی فلمی طرزیں سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلا کاغذوں پر بلاؤز کے نمونے اتار رہی تھی جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان میں سب سے

اچھا تھا سامنے رکھ کر اپنے لئے اُودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کیا۔ اب رضیہ
کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔
شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی جب سینے پرونے بیٹھتی تو
اسکی نشست بڑی پر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری
پسند نہیں کرتی تھی ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ
غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اسکی بہت صحیح ہوتی تھی اس لئے کہ وہ پہلے
کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا مگر چیز بالکل فٹ
تیار ہوتی ہے۔
شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی اس کے ہاتھ بہت
گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ننھا گڑھا
تھا جب وہ مشین چلاتی تھی یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی
غائب بھی ہو جاتے تھے۔
شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اسکی دو یا
تین انگلیاں بڑی رعنائی کے ساتھ مشین کی ہتھی کو گھماتی تھیں اسکی کلائی
میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف کو جھک جاتی تھی اور
بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لئے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی نیچے پھسل
آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک ہوتی تھی کہ وہ اسے ہٹانے یا
جمانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔
جب شکیلہ اُودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ناپ کا بلاوز تراشنے لگی تو

اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اُن کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیمائش کیسے ہو سکتی ہے اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی اس لئے وہ ساری پیمائشیں دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیص اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اُس سے کہا "جاؤ مومن، دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں"۔

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا "کیسا گز بی بی جی"۔

شکیلہ نے جواب دیا "کپڑے کا گز ــــ ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ لوہے کا ہے ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے جو کپڑے کا بنا ہوتا ہے۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں"۔

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لیکر آگیا شکیلہ نے یہ گز اسکے ہاتھ سے لیا اور کہا "یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا۔" پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی "ان لوگوں کی کوئی چیز زیادہ دیر اپنے پاس رکھی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے ـــ ادھر آؤ یہ گز لو اور یہاں سے میرا ناپ لو"

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ناپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی قسم کی باتیں ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

"رضیہ تم گز کھینچ کر ناپ کیوں نہیں لیتیں ـــ پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا تم نے ناپ لیا

اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اوپر کے حصہ پر اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو ادھر اُدھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔

کہاں کالوں، کہاں کا نہ لوں، تم تو عجب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ماپ لینا شروع کیا تو تم نے کہا ذرا نیچے کا لو ــــ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کونسی آفت آجائیگی بھئی واہ ــــ خیر کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو جیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں سلوٹ پڑے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے ــــ لو اب ناپ لو ......"

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "لو اب جلدی کرو" جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں اس نے گھبرا کر کہا۔ "گز لائیے بی بی جی ــــ میں دے آؤں" شکیلا نے اُسے جھڑک دیا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اپنے ننگے بازو سے لپٹ گیا جب شکیلا نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اسکی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی ایک عجیب و غریب خواہش اسکے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اسکی مونچھیں بن جائیں ــــ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو اُسے سرسراہٹ محسوس ہوا کرتی تھی اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور

ناک میں پیدا کی۔

شکیلا کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا۔ اور اسکی بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اسکے تصور میں شکیلا کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا اور بغل میں سے اُس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دیدیا اور کہا جاؤ اُسے واپس دے آؤ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔"

مومن گز واپس دیکر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اسکے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے سے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اس نے عید کیلئے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اسکی ناک تک پہونچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلا بی بی کے پاس جائے اور اُسے سلام کرے ـــــ اسکی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کریگی اور اسکی رومی ٹوپی . . . .

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور لچکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلا بی بی کی آواز آئی "مومن"

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا اور اندر چلا گیا جہاں شکیلہ نمونے کے مطابق اودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر مومن کی طرف متوجہ ہوئی "میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں۔ سو گئے تھے کیا؟"

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی "نہیں بی بی جی"۔

"تو کیا کر رہے تھے"۔

"کچھ ... کچھ بھی نہیں"۔

"کچھ تو ضرور کرتے ہو گے"۔ شکیلا یہ سوال کئے جا رہی تھی مگر اس کا اصل دھیان بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اُسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا "ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا"۔ شکیلا کھلکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

شکیلا کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اس تسکین نے اسکے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے، چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرماہٹ پیدا کر کے اُس نے کہا۔ "بڑی بی بی جی سے پیسے لیکر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا"۔

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کیا کرو گے اس رومال کو؟"

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ "گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی ——— بڑا اچھا معلوم ہو گا"۔ یہ سن کر شکیلا اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

"گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا میں اسی سے پھانسی دے دوں گی تمہیں" یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ سے کہا "کمبخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا" رضیہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟"

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو وہ دو دن سے سیکھ رہی تھی اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ "دیکھو مومن میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں دوائیوں کی دکان کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جس میں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے وہاں جاؤ اور پوچھ کر آؤ کہ ایسے چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا ۔۔ کہنا ہم پوچھ لیں گے۔ اسلئے کچھ رعایت ضرور کرے۔ سمجھ لیا نا۔"

مومن نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"اب تم پرے ہٹ جاؤ۔"

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ گرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی۔ کہنا ہم اسی قسم کی اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہئے۔

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھایا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بو بھی اس میں بسی ہوئی تھی۔ میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلی کے بچے کی طرح ملائم تھا اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا گیا جب بھاؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی اس ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی ہی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکدار تھی

یہ بلاوز شاید عید کے لئے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کیلئے، استری نکالنے کیلئے سوئی ٹوٹی تو نئی سوئی لانے کیلئے۔ شام کے قریب جب شکیلا نے دوسرے روز پر جب باقی کام اٹھا دیا تو وہ دھاگے کے ٹکڑے اور اودی ساٹن کی بیکار کترن اٹھانے کے لئے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں مگر اودی ساٹن کی چمکدار کترن اپنی جیب میں رکھ لیں ـــــ بالکل بے مطلب کیونکہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کو کیا کریگا۔

دوسرے روز اس نے جیب سے کترن نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اُسے شکیلہ نے کئی بار بلایا ـــــ کالی ساٹن کے بلاوز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا اس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جابجا پھیلے ہوئے تھے پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہوئیں اور چکنا ہی دوبالا ہو گئی، اُس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلا نے اسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس جا کر آئینے میں خود اسکو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا جب پورا اطمینان ہو گیا تو اُسے اتارا جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے اس کی ساری خامیاں درست کیں ایک بار پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کی

ادھر اودی ساٹن کا یہ بلاوز سیا جا رہا تھا اُدھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب

خیالوں کے جیسے ٹانکے سے ادھڑ رہے تھے ـــ جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اسکی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے صرف چھو کر ہی نہیں دیکھے بلکہ اسکی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے ـ اپنے کھردرے ہاتھ ـ

اس نے اس ساٹن کے ٹکڑوں سے اسکی ملائمی کا اندازہ کر لیا تھا دھاگے جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے جب اس نے ان کا گچھا بنایا تھا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے ـــ وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے ـ کالے کالے بال مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہیں؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا ـــ مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا کہ شکیلہ اندر آئی ـ قمیص اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا ـــ اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا ـ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی ـ

مومن نے فرش صاف کرتے کرتے آئینے کی طرف دیکھا ـ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی ـ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکیلا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے ـ شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی مومن سے نہ رہ گیا ـ چنانچہ اس نے کہا ـ بی بی جی آپ نے تو درزیوں کو بھی مات کر دیا ـ

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کیلئے بے قرار تھی اس لئے وہ صرف "اچھا سلا ہے نا؟" کہہ کر باہر دوڑ گئی ـــ مومن آئینے کیطرف

دیکھتا رہ گیا جس میں بلاوز کا سیاہ او چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لئے آیا تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے اینگر میں اس بلاوز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اُس نے اسے غور سے دیکھا پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے یہ محسوس ہوا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے

رات کو جب وہ سویا تو اُس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ـــ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا ـــ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تاروں کا گولا بنا ہوا تھا ـــ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے ـــ بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے ـــ پھر آندھی آ گئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا ـــ پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا . . . . دیکھی ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا . . . . نئے لٹھے کی بو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی، پھر نہ جانے کیا ہوا . . . . ایک کالی ساٹن کے بلاوز پر اس کا ہاتھ پڑا . . . . کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے اس کے بعد اسے خوف، تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی . . . . پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوتی تھی مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

قانون کی حفاظت

افراد

سالگ رام .... وکیل ‏ سروپ .... موکل
چمپا .... وکیل کی لڑکی ‏ ساوتری .... وکیل کی بیوی
اور منشی

پہلا منظر

ایک بڑا کمرہ جیسا کہ عام طور پر کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کا ہوتا ہے اس کے وسط میں ایک بہت بڑا میز ہے جس پر بے شمار کاغذات پڑے ہیں. کچھ پلندوں کی صورت میں، کچھ بکھرے ہوئے اور کچھ ٹریز میں، سامنے ریک میں بھاری بھرکم کتابیں رکھی ہیں. کمرے کی دیواروں کے ساتھ بڑی بڑی الماریاں ہیں جو قانونی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں اس میز کے ساتھ گھومنے والی کرسی پر وکیل صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے ایک طرف فرش پر انکا منشی

چشمہ چڑھائے ڈیسک کے پاس بیٹھا ہے اور کاغذات دیکھنے میں مصروف ہے وکیل صاحب کے سامنے ان کا موکل بیٹھا ہے جو اپنی گفتگو ختم کر چکا ہے اور جانے کے قریب ہے۔

وکیل :۔ منشی جی۔ ان کے مقدمے کی تاریخ وغیرہ نوٹ کر لو اور دیکھو کل مجھے یاد سے یہ کاغذات دے دینا تاکہ میں ان کا مطالعہ کر لوں ـــــ آج تاریخ کیا ہے ؟

منشی :۔ آٹھ !

وکیل :۔ مہینہ ؟

منشی :۔ مارچ !

وکیل :۔ سن ؟

منشی :۔ چالیس !

وکیل (موکل سے) معاف کیجئے گا میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ کثرت کار کے باعث مجھے بہت سی باتیں بھول جاتی ہیں۔ کیا کہا تھا منشی جی سن کیا ہے ؟ چالیس۔ آٹھ مارچ سن چالیس ـــــ یہ لیجئے رسید (موکل رسید دیتا ہے) آپ کا اسم گرامی نہیں ـــ نہیں ـــ یہاں لکھا تو ہے ـــــ ہاں مسٹر نرائن اب آپ تشریف لیجا سکتے ہیں۔ پرماتما نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نرائن :۔ (اٹھ کر) اچھا نمسکار وکیل صاحب

وکیل :۔ نمسکار !

(نرائن چلا جاتا ہے۔ وکیل میز پر کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے)

وکیل :۔ (ایک کتاب ڈھیرے سے اٹھاتے ہوئے) ہاں منشی جی اب کیا ہے ؟

منشی :- ایک اور موکل باقی رہ گیا ہے۔ نوجوان چھوکرا ہے۔ کہتا ہے کہ آپ سے کوئی قانونی مشورہ کرنا ہے معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھا ہے۔
(فرش پر سے اُٹھتا ہے اور دروازے کی جانب چلتا ہے)
وکیل :- یہاں جو بھی آتا ہے۔ ایسی ویسی بات ہی کر کے آتا ہے۔ بھیج دو اسے اندر
(منشی باہر جاکر ایک نوجوان آدمی کو ساتھ لاتا ہے)
سروپ :- گڈ مارننگ
وکیل :- گڈ مارننگ
(منشی اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے)
سروپ (کرسی پر بیٹھ کر) میں نے اپنے ایک دوست سے آپکی بہت تعریف سنی ہے۔ ویسے اخباروں میں بھی آپ کا نام پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے دراصل آپ سے ایک قانونی مشورہ لینا ہے۔
وکیل :- بڑے شوق سے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میری فیس بہت زیادہ ہے
سروپ :- کچھ بھی زیادہ نہیں ——— میں دگنی فیس دینے کیلئے تیار ہوں اگر آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتائیں ——— مگر ٹھہریئے ——— پہلے آپ یہ بتایئے کیا اچھا قانون داں قانون توڑ سکتا ہے؟
وکیل :- کیوں نہیں قانون بنائے ہی اس لئے گئے ہیں کہ توڑے جائیں اچھا قانون داں جب چاہے قانون کو توڑ مروڑ سکتا ہے۔
سروپ :- تو میں عرض کروں میں کیا چاہتا ہوں؟
وکیل :- فرمایئے!

سروپ ۔میرا نام رام سروپ ہے ـــــ میں بی اے میں پڑھتا ہوں ـــــ ایک لڑکی سے مجھے پریم ہو گیا ہے جس کا نام ـــــ میں بتا دوں تو کوئی حرج تو نہیں ہو گا؟ ـــــ یعنی وہ آپ ہی تک رہے گا نا؟

وکیل :۔ صاحبزادے! یہاں کوئیں کے کوئیں خالی کر دیئے مگر اب خشک رہے کہو جو کچھ تمہیں کہنا ہے بے خوف ہو کے کہو ڈاکٹروں اور وکیلوں کو سب بھید بتانے پڑتے ہیں

سروپ :۔ ہاں تو وکیل صاحب بات یہ ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے جس کا نام چمپا ہے بیحد محبت ہو گئی ہے۔ اس کو بھی مجھ سے پریم ہے۔

وکیل :۔ تو مشکل کیا ہے ـــــ کیا کہا ـــــ لڑکی کا نام کیا ہے؟

سروپ :۔ چمپا ـــــ!

وکیل :۔ ہوں ـــــ تو اب مشکل کیا آن پڑی ہے ـــــ تم کو ـــــ؟

سروپ :۔ جی نہیں ۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ اسکے والدین راضی نہیں ہونگے ۔ اسلئے کہ اسکی بات کہیں اور پکی کر دی گئی ہے۔ میں اب یہ چاہتا ہوں کہ اس کو اغوا کر کے لیجاؤں اور کسی دوسرے شہر میں اس سے باقاعدہ شادی کر لوں ـــــ آپ کا کیا خیال ہے؟

وکیل :۔ اس کو اغوا کر کے لے جاؤ ۔ جانتے ہو اس جرم کی سزا کتنی زبردست ہے؟

سروپ :۔ مجھے معلوم ہے ۔ مگر لڑکی رضامند ہے یعنی جب میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی جب اسکو میری دھرم پتنی بننا منظور ہے تو سزا اور جرم کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے

وکیل :۔ اغوا کے بعد اگر لڑکی پر اس کے ماں باپ نے اثر ڈالا اور اسے مجبور کیا کہ وہ تمہارے خلاف بیان دے تو سزا اور جرم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے ایسے معاملوں میں وثوق سے

ساتھ کچھ بھی نہیں لاتی۔

سُروپ (خوشی سے اچھل کر او مارا ـــ کیا کہنے ہیں آپ کے وکیل صاحب ـــ کیا نکتہ پیدا کیا ہے

وکیل :۔ (کرسی پر بیٹھ کر) تم لڑکی کو کالج ہی سے بھگا کر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو نا؟

سُروپ :۔ جی ہاں! لیکن اگر آپ چاہیں ـــ یعنی یہ کوئی ضروری نہیں کہ اُسے کالج ہی سے اغوا کیا جائے۔ آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کرونگا۔

وکیل :۔ نہیں۔ نہیں کالج ہی اچھا ہے۔ تو ایک بات یہ کرنا کہ کالج سے نکل کر تم دونوں کسی فوٹو گرافر کے پاس چلے جانا اور اپنا فوٹو کھچوا لینا۔

سُروپ :۔ یہ فوٹو پاس رکھ لیا جائے۔

وکیل :۔ نہیں۔ اسکی ضرورت نہیں فوٹو گرافر کے پاس وہ بالکل محفوظ رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو فوراً منگا لیا جائے گا۔

سُروپ :۔ اس کی کیا ضرورت ہوگی۔

وکیل :۔ صاحبزادے! اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اس روز لڑکی کے پاس چند زیور تھے جو اس نے پہن رکھے تھے اور اس بات کا ضرور خیال رہے کہ لڑکی اپنی ماں کو یا باپ کو کسی ذریعہ سے مطلع کر دے کہ وہ اب گھر نہیں آئے گی اس لئے کہ وہ تمہارے ساتھ جا رہی ہے اور دیکھو اگر تم شادی کے دعوتی رقعے چھپوا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کر دو تو بڑا مزا رہے گا۔ شادی تم اغوا ہی کے روز کرو گے نا؟

سُروپ :۔ جی ہاں۔

وکیل :- (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) تو ابھی جا کر رقعے چھپوا لو اور اپنے ان دوستوں اور رشتہ داروں کے نام پوسٹ کر دو جو دوسرے شہروں میں رہتے ہوں۔ شادی کا انتظام وغیرہ تو ہو چکا ہے نا؟

شروپ :- (اٹھ کر) جی ہاں! سب انتظام مکمل ہے۔

وکیل :- تو جاؤ بے کھٹکے اپنا کام کرو۔ قانون تمہاری حفاظت کرے گا۔

شروپ :- شکریہ وکیل صاحب بہت بہت شکریہ۔ اب تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں لوہے کے جنگلے کے پیچھے کھڑا ہوں۔ کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا، یہ ہی آپ کی مہربانی ہے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔

(تین نوٹ دس دس کے بٹوے سے نکال کر وکیل کو دیتا ہے۔ وکیل مسکرا کر یہ نوٹ پکڑتا ہے اور میز پر ایک بلورین پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیتا ہے)

شروپ :- اچھا! نمسکار وکیل صاحب

وکیل :- (مسکراتے ہوئے) نمسکار

(شروپ چلا جاتا ہے)

وکیل :- (منشی سے مخاطب ہو کر) لوگ سمجھتے ہیں کہ اُفتاد آ پڑنے کے بعد ہی وکیلوں سے مشورہ لینا چاہئے۔ یہ غلط ہے۔ افتاد سے پہلے وکیل زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں اگر غلطی کرنے سے پہلے وکیل کی رائے طلب کر لی جائے تو جیل خانے اتنے آباد نہ ہوں اور نہ کچہریوں میں اتنی رونق ہو۔ وکیل کے پیشے کا صحیح مطلب آج اس چھوکرے نے سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اب بالکل محفوظ ہے

منشی :- جی ہاں! اس میں کیا شک ہے؟

وکیل :- (مسکراتا ہے اور پیپرویٹ کے نیچے سے نوٹ نکال کر جیب میں رکھ لیتا ہے)
بڑا محتاط لڑکا تھا۔

دوسرا منظر

سالگ رام وکیل کا گھر —— ڈرائنگ روم —— وکیل کی بیوی ایک صوفے پر بیٹھی اونی بنیان بُن رہی ہے۔ سامنے دیوار پر ایک خوبصورت لڑکی کے فوٹو کا انلارجمنٹ خوبصورت فریم میں لٹکتا دکھائی دیتا ہے —— پردہ اٹھتا ہے تو چند لمحات کے توقف کے بعد سالگ رام وکیل ہاتھ میں ایک کارڈ لئے ہنستا ہنستا اندر داخل ہوتا ہے۔

وکیل کی بیوی (بُنتے بُنتے اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے) یہ آج اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟
(وکیل جواب نہیں دیتا۔ ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھتا ہے لیکن اس دوران میں بھی اس کی ہنسی بند نہیں ہوئی)

وکیل کی بیوی :- ضرور تم نے وہ بات سن لی ہوگی؟

وکیل :- (ہنستے ہنستے) کونسی بات؟ میں تو شادی کا یہ کارڈ پڑھ کر ہنس رہا تھا (ہنستا ہے) اُس نے مجھے ایک کارڈ بھیج دیا۔ آج کل کے یہ لونڈے کتنے تیز ہوتے ہیں۔

وکیل کی بیوی :- جانے کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا اور سنتے ہو آج کیا تماشا ہوا۔ پولیس کی چوکی سے ایک آدمی آیا۔

وکیل :- (حیرت سے) پولیس کی چوکی سے؟ کیوں؟
بیوی :- یہ پوچھنے آیا تھا کہ ہمارے گھر میں کتنے کی چوری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا کچھ چُرایا گیا ہے؟
وکیل :- (جلدی جلدی) پوچھتا تھا کہ ہمارے گھر میں کتنے کی چوری ہوئی ہے اور ـــ اور ـــ تم ـــ تم نے کہہ دیا کہ ہمارا کچھ بھی نہیں گیا ـــ تم نے اس سے کہدیا کہ ہماری کوئی چیز بھی نہیں چرائی گئی او میرے بھگوان ـــ چمپا کہاں ہے؟ ـــ ارے ہاں ـــ اس نے بھی تو چمپا ہی کہا تھا۔
بیوی - چمپا چمپا کیا کہہ رہے ہو چمپا ہوگی کالج میں ـــ تو اور میں اس سے کیا جھوٹ بولتی۔ یہ کہتی کہ ہمارا سب گھر بار لٹ گیا ہے ـــ جانے کس کی چوری ہوئی اور وہ موا ہمارے پاس چلا آیا ـــ میں نے اس سے کہا" ہمارے یہاں چور آکے کیا کرینگے۔ ہمارا روپیہ بنک میں زیور جو ہیں وہ بھی بنک میں ـــ وہ سو روپئے جو تم گھر کے خرچ کے لئے دے گئے تھے میز کے دراز میں محفوظ پڑے تھے۔
(وکیل کا سر چکرا تا ہے اور لڑکھڑا کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھتی ہے) ہے ہے تمہارے دشمنوں کو کیا ہوگیا ہے؟ چمپا کے بتا ـــ چمپا کے بتا
وکیل :- (بوکھلا کر) چمپا گئی ـــ چمپا گئی ـــ!
بیوی :- کہاں گئی؟ ـــ بس ابھی آتی ہوگی ـــ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے دشمنوں کو تکلیف کیا ہے۔ اے راما ـــ اے راما ـــ ایک گلاس

ٹھنڈے پانی کا لا۔ بابو جی کے لئے ــــ بھاگ کے لا ــــ بھاگ کے ــــ ہے ہے تمہارا رنگ تو ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا ہے۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیوی:۔ (چونگا اٹھا کر) ہلو ہلو ــــ ہلو ــــ میں بول رہی ہوں۔ چمپا کیا کہا؟ نہیں، نہیں تم نہیں جا سکتیں۔ تمہارے پتا جی بیمار ہیں۔

وکیل:۔ کون ہے؟ ــــ کون ہے ــــ ؟ چمپا ہے؟ کیا کہتی ہے؟ ــــ

بیوی:۔ چپ بھی کرو۔ سننے تو دو ــــ کیا کہا ــــ (تھوڑا وقفہ) ــــ تم شادی کرنے جا رہے ہو ــــ میرے بھگوان (چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

وکیل:۔ (بے ہوش بیوی کے پاس جا کر) ساوتری ــــ ساوتری ــــ کیا کہا ہے چمپا نے؟ ساوتری۔ ساوتری بے ہوش ہو گئی! راما راما ــــ اور راما ــــ کوئی بھی تو نہیں یہاں ــــ ساوتری ــــ ساوتری ــــ چمپا گئی ــــ وہ لونڈا لے گیا اُسے ــــ اور میں نے ــــ میں نے تیس روپیے لے کر اسے سارے ڈھنگ بتا دیئے۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی ــــ میں ــــ اب کیا کروں؟ ساوتری۔ ساوتری ــــ (اسکی بیوی بیہوشی میں چمپا کہتی ہے) چمپا گئی اور میں نے سارا قانون اس کے ہاتھ میں دیدیا ــــ اب کچھ نہیں ہو سکتا میں کتنا بے وقوف ہوں۔ وہ چمپا چمپا کہتا رہا اور مجھے ذرا بھی شک نہ ہوا۔ شادی کے رقعے پر اپنا نام بھی دیکھا

اور میرے دماغ میں یہ بات نہ آئی ـــــ اور راما ـــــ یہ کہاں مر گیا
ہے آج ـــــ ساوتری ـــــ خط تو اس نے لکھوا لیا
ہو گا۔ اس نے میرے کہے پر حرف بحرف عمل کیا ہو گا۔ (اٹھتا ہے اور ٹیلیفون
کرنے لگتا ہے) ٹیلیفون کردوں؟ ـــــ پر کیسے کروں؟ (ٹیلیفون کی گھنٹی
بجتی ہے) ـــــ یہ کون ہے ـــــ یہ کون ہے ـــــ ہلو ـــــ
ہاں ـــــ ہاں ـــــ مس چمپا سالگ رام ـــــ کسی نے فوٹو و وٹو تو
نہیں کھنچایا یہاں سے (ریسیور رکھ دیتا ہے لیکن فوراً ہی کچھ یاد کرکے اُسے
اٹھا لیتا ہے) ارے ہاں فوٹو؟ چمپا اور اس کا فوٹو ـــــ یہ کون
فوٹوگرافر تھا؟ (غصے سے ریسیور پٹک دیتا ہے اور بے ہوش بیوی کی طرف جاتا ہے)
ساوتری ـــــ ساوتری ـــــ پرماتما کے لئے ہوش میں آؤ۔ پرماتما
کے لئے ہوش میں آؤ ـــــ اب میں بے ہوش ہونا چاہتا ہوں ـــــ
ساوتری ـــــ ساوتری ـــــ (بے ہوش ہو جاتا ہے)

پردہ

سشیرو

چیڑ اور دیودار کے ناہموار تختوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جسے چوبی جھونپڑا کہنا بجا ہے۔ یہ دو منزلیں تھیں۔ نیچے بھٹیار خانہ تھا جہاں کھانا پکایا اور کھایا جاتا تھا اور بالائی منزل مسافروں کی رہائش کیلئے مخصوص تھی۔ یہ منزل دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک کافی کشادہ تھا جس کا دروازہ سڑک کی دوسری طرف کھلتا تھا۔ دوسرا کمرہ جو طول و عرض میں اس سے نصف تھا بھٹیار خانے کے عین اوپر واقع تھا۔ یہ میں نے کچھ عرصے کے لئے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چونکہ ساتھ والے حلوائی کے مکان کی ساخت بھی بالکل اسی مکان جیسی تھی اور ان دونوں جگہوں کیلئے ایک ہی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس لئے اکثر اوقات حلوائی کی کتیا اپنے گھر جانے کے بجائے میرے کمرے میں چلی آتی تھی۔

اس عمارت کے تختوں کو آپس میں بہت ہی بھونڈے طریقے سے جوڑا گیا تھا۔ پیچ بہت کم استعمال کئے گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کو لکڑی میں داخل کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے، کیلیں کچھ اس بے ربطی سے ٹھونکی گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا اس

مکان کو بنانے والا بالکل اناڑی تھا۔ کیلوں کے درمیان فاصلہ کی یکسانی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ جہاں ہاتھ ٹھیر گیا وہیں پر کیل ایک ہی ضرب میں چت کر دی گئی تھی۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا تھا کہ لکڑی پھٹ رہی ہے یا کیل ہی بالکل ٹیڑھی ہو گئی ہے۔

چھت ٹین سے پاٹی ہوئی تھی، جس کی قینچی میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کمرے کے باقی تختوں کی طرح چھت کی کڑیاں بھی رنگ و روغن سے بے نیاز تھیں البتہ ان پر کہیں کہیں چڑیوں کی سفید بیٹیں سفیدی کے چھینٹوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ میرے کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں۔ درمیانی کھڑکی طول و عرض میں دروازے کے برابر تھی۔ باقی دو کھڑکیاں چھوٹی تھیں ان کے کواڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ مالک مکان کا کبھی ارادہ تھا کہ ان میں شیشے جڑائے، پر اب ان کے بجائے ٹین کے ٹکڑے اور لکڑی کے موٹے موٹے ناہموار ٹکڑے جڑے تھے۔ کہیں کہیں لندن ٹائمز اور ٹریبیون اخبار کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے۔ جن کا رنگ دھوئیں اور بارش کی وجہ سے خستہ بسکٹوں کی طرح بھوسلا ہو گیا تھا۔ یہ کھڑکیاں جنکی گنڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ بازار کی طرف کھلتی تھیں اور ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ اس لئے کہ ان کو بند کرنے کیلئے کافی وقت اور محنت کی ضرورت تھی۔

کھڑکیوں میں سے دور نظر ڈالنے پر پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ٹیڑھی بنگی مانگ کی طرح "کشتواڑ" اور "بھدروا" جانے والی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی گئی اور آخر میں آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مل گئی تھی۔

کمرے کا فرش خالص مٹی کا تھا جو کپڑوں کو چمٹ جاتی تھی اور دھوبی کی کوششوں کے باوجود اپنا گیروا رنگ نہ چھوڑتی تھی۔ فرش پر پان کی پیک کے داغ جا بجا

بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کونوں میں چھوڑی ہوئی ہڈیاں بھی پڑی رہتی تھیں جو ہر روز جھاڑو سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ حاصل کر لیتی تھیں۔

اس کمرے کے ایک کونے میں میری چارپائی بچھی تھی جو بیک وقت میز، کرسی اور بستر کا کام دیتی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار پر چند کیلیں ٹھنکی ہوئی تھیں ان پر میں نے اپنے کپڑے وغیرہ لٹکا دیئے تھے۔ دن میں پانچ چھ مرتبہ میں ان کو لٹکاتا رہتا تھا اس لئے کہ ہوا کی تیزی سے یہ اکثر گرتے رہتے تھے۔

کشمیر جانے یا وہاں سے آنے والے کئی مسافر اس کمرے میں ٹھہرے ہونگے بعض نے آتے جاتے وقت تختوں پر چاک کی ڈلی یا پنسل سے کچھ نشانی کے طور پر لکھ دیا تھا۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ والے تختے پر کسی صاحب نے یادداشت کے طور پر پنسل سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ۲۵/۵/۴ سے دودھ شروع کیا اور ایک روپیہ پیشگی دیا گیا۔

اس طرح ایک اور تختے پر یہ مندرج تھا۔

دھوبی کو کل پندرہ کپڑے دیئے گئے تھے جن میں سے وہ دو کم لایا۔

میرے سرہانے کے قریب ایک تختے پر یہ شعر لکھا تھا۔

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کے نیچے "علیم نیّر" لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نویسندہ کا نام ہوگا۔ یہی شعر کمرے کے ایک اور تختے پر لکھا تھا مگر زرد چاک سے اس کے اوپر تاریخ بھی لکھ دی گئی تھی۔ ایک اور تختے پر یہ شعر مرقوم تھا ؎

میرے گھر آئے عنایت آپ نے مجھ پر یہ کی
میرے سر آنکھوں پہ آؤ، تھی یہ کب قسمت میری

اس سے دور ایک کونے میں یہ مصرعہ لکھا تھا۔

ایک ہی شب گو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے

اس مصرعے کے پاس ہی اسی خط میں پنجابی کے یہ شعر مرقوم تھے ؎

تیرے باہجھ نہ اسی قرار دل نوں، جذبہ پریم والا بے پناہ رہے گا
لکھ اکھیاں توں ہوویں دور بانو ایپر دلاں نوں دلاں ندا راہ رہے گا
تیرے میرے پیار دا رب جانے، نگو نالے دا نیر گواہ رہے گا

ترجمہ :- تیرے بغیر میرے دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ جذبہ محبت بے پناہ رہے گا تو لاکھ میری آنکھوں سے دور ہو لیکن دل کو دل کی راہ رہے گی۔ تیرے اور میرے پریم کو صرف خدا جانتا ہے۔ لیکن "نگو نالہ" کا پانی بھی اسکا گواہ رہے گا۔
میں نے ان اشعار کو غور سے پڑھا۔ ایک بار نہیں کئی بار پڑھا، نہ معلوم اُن میں کیا جاذبیت تھی کہ پڑھتے پڑھتے میں نے "ہیر" کی دلنواز دھن میں انہیں گانا شروع کر دیا۔ لفظوں کا روکھاپن یوں بالکل دور ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لفظ پگھل کر اُس دھن میں حل ہو گئے ہیں۔

یہ شعر کسی خاص واقعہ کے تاثرات تھے۔ نگو نالہ ہوٹل سے ایک میل کے فاصلہ پر شہتوتوں اور اخروٹ کے درختوں کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ میں یہاں کئی بار ہو آیا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی میں غوطے لگا چکا تھا۔ اس کے ننھے ننھے پتھروں سے گھنٹوں کھیل چکا تھا لیکن یہ بانو کون تھی؟ . . . . . یہ بانو جس کا نام کشمیر کے

بگو گوشے کی یاد تازہ کرتا تھا۔

میں نے اس بانو کو اس پہاڑی گاؤں میں ہر جگہ تلاش کیا مگر ناکام رہا اگر شاعر نے اس کی کوئی نشانی بتا دی ہوتی تو بہت ممکن ہے مگو نالے ہی کے پاس اُس کی اور میری مڈبھیڑ ہو جاتی اس مگو نالے کے پاس جس کا پانی میرے بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتا تھا۔

میں نے ہر جگہ بانو کو ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی۔ اس موہوم جستجو میں اکثر اوقات مجھے اپنی بیوقوفی پر بہت ہنسی آئی، کیونکہ بہت ممکن تھا کہ وہ اشعار سرے ہی سے مہمل ہوں اور کسی نوجوان شاعر نے اپنا من پرچانے کے لئے گھڑ دیئے ہوں مگر خدا معلوم کیوں مجھے اس بات کا دلی یقین تھا کہ بانو ـــــ وہ بانو جو آنکھوں سے دور ہونے پر بھی اس شاعر کے دل میں موجود ہے ضرور اس پہاڑی گاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو میرا یقین اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے فضا میں اس کا تنفس گھلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

مگو نالے کے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ ادھر آنکلے اور میں اسے پہچان جاؤں لیکن وہ نہ آئی۔ کئی لڑکیاں خوبصورت اور بدصورت میری نظروں سے گزریں مگر مجھے بانو دکھائی نہ دی۔ مگو نالے کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے ناشپاتی کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، اخروٹ کے گھنے درختوں میں پرندوں کی نغمہ ریزیاں اور گیلی زمین پر سبز اور ریشمیں گھاس، میرے دل و دماغ پر ایک خوش گوار تکان پیدا کر دیتی تھی، اور میں بانو کے حسین تصور میں کھو جاتا تھا۔

ایک روز شام کو مگو نالے کے ایک چوڑے چکلے پتھر پر لیٹا تھا خنک ہوا

جنگلی بوٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی چل رہی تھی۔ فضا کا ہر ذرہ ایک عظیم الشان اور ناقابل بیان محبت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابلیں زمین پر رہنے والوں کو گویا یہ پیغام دے رہی تھیں "اٹھو، تم بھی ان بلندیوں میں پرواز کرو۔"

میں نیچر کی ان سحر کاریوں کا لیٹے لیٹے تماشا کر رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے خشک ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے مڑ کر دیکھا جھاڑیوں کے پیچھے کوئی بیٹھا خشک ٹہنیاں توڑ رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سلیپر پہن کر اُس طرف روانہ ہو گیا کہ دیکھوں کون ہے۔

ایک لڑکی تھی جو خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا بنا کر باندھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بھدّی اور کن سری آواز میں "ماہیا" گا رہی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ آگے بڑھوں اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہوں کہ خدا کے لئے نہ گاؤ! ...... لکڑیوں کا گٹھا اُٹھاؤ اور جاؤ مجھے اذیت پہنچ رہی ہے۔" لیکن مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی، کیونکہ اس نے خود بخود گانا بند کر دیا۔

گٹھا اُٹھانے کی خاطر جب وہ مڑی تو میں نے اسے دیکھا اور پہچان لیا یہ وہی لڑکی تھی جو بھٹیار خانے کے لئے ہر روز شام کو ایندھن لایا کرتی تھی۔ میلی سی شکل و صورت تھی۔ ہاتھ پاؤں بیحد غلیظ تھے۔ سر کے بالوں میں بھی کافی میل جم رہا تھا

اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں جب اُٹھ کر دیکھنے آیا تھا تو دل میں آئی کہ چلو اس سے کچھ باتیں ہی کر لیں۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا "یہ ایندھن جو تم نے اکٹھا کیا ہے بابا تمہیں کتنا کیا دیگا؟"

جما اس بھٹیار خانے کے مالک کا نام تھا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "ایک آنہ"

"صرف ایک آنہ۔"

"کبھی کبھی پانچ پیسے بھی دے دیتا ہے۔

"تو سارا دن محنت کر کے تم ایک آنہ یا پانچ پیسے کماتی ہو۔"

اُس نے گٹھے کی خشک لکڑیوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ نہیں دن میں ایسے دو گٹھے تیار ہو جاتے ہیں۔"

"تو دو آنے ہو گئے۔"

"کافی ہیں"

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔ "تم وہی ہو نا جو بھٹیار خانے کے اوپر رہتے ہو۔"

میں نے جواب دیا، ہاں وہی ہوں۔ تم مجھے کئی بار وہاں دیکھ چکی ہو"

"یہ تم نے کیسے جانا۔"

"اس لئے کہ میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ کر گٹھا اٹھانے لگی۔ میں آگے بڑھا۔ "ٹھہرو میں اٹھوا دیتا ہوں۔" گٹھا اٹھواتے ہوئے لکڑی کا ایک نوکیلا ٹکڑا اس زور سے میری انگلی میں چبھا کہ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لئے۔ وہ سر پر رسی کو اٹکا کر

گٹھے کو قریب قریب اٹھا چکی تھی۔ میرے ہاتھ ہٹانے سے اس کا توازن قائم نہ رہا اور وہ لڑکھڑائی۔ میں نے فوراً اُسے تھام لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی کمر سے لیکر اٹھے ہوئے بازو کی بغل تک گھسیٹتا چلا گیا وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ سر پر رسی کو اچھی طرح جمانے کے بعد اس نے میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔

میری انگلی سے خون جاری تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر۔۔۔ اس پر باندھا اور رگو نالے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس پتھر پر بیٹھ کر میں نے اپنی زخمی انگلی کو پانی سے دھو کر صاف کیا اور اس پر رومال باندھ کر سوچنے لگا۔ یہ بھی اچھی رہی۔ بیٹھے بٹھائے اپنی انگلی لہولہان کر لی ——— خود ہی اٹھا لیتی میں نے بھلا یہ تکلف کیوں کیا۔"

یہاں سے میں اپنے ہوٹل، معاف کیجئے گا بھٹیار خانے پہونچا اور کھانا دانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک کھانا ہضم کرنے کی غرض سے کمرے میں میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر کچھ دیر تک لالٹین کی اندھی روشنی میں ایک واہیات کتاب پڑھتا رہا۔ سچ پوچھئے تو ارد گرد ہر شئے واہیات تھی۔ لال مٹی جو کپڑے کے ساتھ ایک دفعہ لگتی تھی تو دھوبی کے پاس جا کر بھی الگ نہ ہوتی تھی اور وہ آپس میں نہایت ہی بھونڈے طریقے پر جوڑے ہوئے تختے اور ان پر لکھے ہوئے غلط اشعار اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں جو ہر روز جھاڑو کی زد سے کسی نہ کسی طرح بچ کر میری چارپائی کے پاس نظر آتی تھیں۔

کتاب ایک طرف رکھ کر میں نے لالٹین کی طرف دیکھا۔ مجھے اس میں

اور اس لکڑیاں چننے والی میں ایک گونہ مماثلت نظر آئی۔ کیونکہ لالٹین کی چمنی کی طرح اس لڑکی کا لباس بھی بحد غلیظ تھا۔ مجھے اس کو بجھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ میں نے سوچا، تھوڑی ہی دیر میں دھوئیں کی وجہ سے یہ اس قدر اندھی ہو جائے گی کہ خود بخود اندھیرا ہو جائے گا۔

کھڑکیاں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کو بھی نہ کھولا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات کے نو یا دس بج چکے تھے۔ سونے ہی والا تھا کہ بازار میں ایک کتّا زور سے بھونکا جیسے اسکی پسلی میں یکایکی درد اٹھ کھڑا ہوا ہے میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنتیں بھیجیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا مگر فوراً ہی نزدیک و دور سے کئی کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں ایک عجیب و غریب سبتک قائم ہو گیا۔ اگر کوئی کتّا ایک سر چھیڑتا تو سبتک کے سارے سر فضا میں گونجنے لگتے۔ میری نیند حرام ہو گئی۔

دیر تک میں نے صبر کیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا تو میں اٹھا دوسرے کمرے میں گیا اور اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں اترا اور جو پتھر میرے ہاتھ میں آیا مارنا شروع کر دیا۔ ایک دو پتھر کتوں کے لگے کیونکہ نہایت ہی مکروہ آوازیں بلند ہوئیں میں نے اس کامیابی پر اور زیادہ پتھر پھینکنے شروع کئے۔ دفعتہً کسی انسان کے "اُف" کرنے کی آواز سنائی دی۔ میرا ہاتھ وہیں پتھر بن گیا۔

آواز کسی عورت کی تھی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی، ادھر تیز قدمی سے گیا تو میں نے دیکھا کہ نیچے ایک لڑکی دوہری ہو کر کراہ

رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ کھڑی ہو گئی..... بدلی کے پیچھے چھپے ہوئے چاند کی دھندلی روشنی میں مجھے اپنے سامنے وہی ایندھن چننے والی لڑکی نظر آئی۔ اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میری غفلت کے باعث اُسے اتنی تکلیف ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے معاف کر دینا..... لیکن تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اوپر چڑھ رہی تھی۔"

"رات کو اس وقت تمہیں کیا کام تھا۔"

اس نے کرتے کی آستین سے ماتھے کا خون صاف کیا اور کہا "اپنے کتے شیرو کو ڈھونڈ رہی تھی۔"

بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ "اور میں تمام کتوں کا خون کر دینے کا تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔"

وہ بھی ہنس دی

"کہاں ہے تمہارا شیرو؟"

"اللہ جانے کہاں گیا ہے۔ یوں ہی سارا دن مارا مارا پھرتا ہے"

"تو اب کیسے تلاش کرو گی۔"

"یہیں سڑک پر مل جائے گا کہیں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ اسے تلاش کر دوں؟"

نیند میری آنکھوں سے بالکل اڑ چکی تھی اس لئے میں نے کہا کہ

چلو کچھ دیر شغل رہے گا۔ لیکن اس نے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں میں اسے آپ ہی ڈھونڈ لوں گی۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہوگا۔"
"ابھی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔"
"میرا خیال ہے کہ تمہارے مکان کے پچھواڑے ہوگا۔"
"تو چلو مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے کیوں کہ میں پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔"

ہم دونوں بھٹیار خانے کے پچھواڑے کی جانب روانہ ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کبھی کبھی بدن پر خوشگوار کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ چاند ابھی تک بادل کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ روشنی تھی مگر بہت ہی دھندلی جو رات کی خنکی میں بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھی جی چاہتا کہ آدمی کمبل اوڑھ کے لیٹ جائے اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچے۔

سڑک طے کر کے ہم اوپر چڑھے اور بھٹیار خانے کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ میرے آگے تھی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی اور منہ پھیر کر عجیب و غریب لہجے میں اس نے کہا۔ "دور و فان ہو گا مرادا!"
ایک موٹا تازہ کتا نمودار ہوا اور اپنے ساتھ حلوائی کی کتیا کو گھسیٹتا ہوا ہمارے پاس سے گزر گیا۔
دروازہ کھلا تھا میں اسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا۔
لالٹین کی چمنی ابھی مکمل طور پر سیاہ نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ

ایک کونے سے جو اس کالک سے بچ گیا تھا تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہم باہر نکلے۔ چاند اب بادل میں سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر اس کا کتّا شیرو بڑے سے پتھر کے پاس بیٹھا اپنا بدن صاف کر رہا تھا۔ اس سے کچھ دور حلوائی کی کتیا کھڑی تھی۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے اُس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بانو"

"بانو؟" . . . . میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اب اس نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔"

میں نے جواب دیا "شیرو"

ایک مرد

پہلا منظر

(زنانہ کالج کے ہوسٹل کا ایک کمرہ ــــــ مختصر ساز و سامان، لیکن ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی نظر آتی ہے۔ کمرے کے دو حصے ہیں ایک آگے دوسرا پیچھے بیچ میں دیوار ہے لیکن اس میں دو بڑے بڑے بغیر کواڑوں کے دروازے ہیں اُن میں سے ایک سے کمرے کا دوسرا حصہ نظر آتا ہے اور وہ کھڑکی بھی دکھائی دیتی ہے جو دوسری طرف میدان میں کھلتی ہے۔ کمرے کے دوسرے حصے میں پلنگ بچھا ہے اس کے پاس تپائی رکھی ہے۔ کھڑکی کے پاس آرام کرسی پڑی ہے کمرے کے پچھلے حصے یعنی پیش منظر میں سنتوش ایک کرسی پر بیٹھی اور دوسری کرسی پر ٹانگیں رکھے کتاب پڑھنے میں مصروف ہے ــــــ اس دروازے پر جو ہوسٹل کی غلام گردش کی طرف کھلتا ہے دستک ہوتی ہے)

سنتوش: ـ آجاؤ ــــــ دروازہ کھلا ہے

(دروازہ کھلتا ہے۔ سنتوش کی سہیلی عذرا داخل ہوتی ہے)

عذرا :- کیا پڑھ رہی ہو؟

سنتوش :- کچھ کہنا ہو تو فوراً کہہ دیا کرو —— تمہیدیں نہ باندھا کرو —— بولو کیا چاہتی ہو؟

عذرا :- نوج تم سے کوئی بات کرے —— ہر وقت منہ سُجائے بیٹھی رہتی ہو۔

سنتوش :- میں گھر سے یہاں پڑھنے آئی ہوں، تفریح کرنے نہیں آئی۔

عذرا :- جی!

سنتوش :- جی!

عذرا :- جی —— ایک صرف آپ گھر سے یہاں پڑھنے آئی ہیں باقی سب تفریح کی غرض سے آئی ہیں —— ایسی سڑی لسی بات کرتی ہو کہ جی چاہتا ہے تم سے لڑنا شروع کر دوں —— یہ تمہارے چہرے پر جو سنجیدگی اور متانت کا غلاف چڑھا رہتا ہے ایک ہی جھٹکے میں اتار دوں

سنتوش :- تین برس گزر جانے پر بھی تمہارا یہ ارادہ مضبوط نہیں ہو سکا۔ اسکی وجہ؟

عذرا :- تمہارا سر —— اِس کی وجہ کیا ہے؟ اُس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہوتا ہے وہ کیوں ہوتا ہے؟ —— ہر بات میں قانون کی ایک نخ لگی رہتی ہے۔ وجہیں دریافت کی جا رہی ہیں۔ اسباب تلاش کئے جا رہے ہیں —— جانے اُس شریف آدمی کا کیا حال ہوگا جو تم سے شادی کرنے کی حماقت کریگا

سنتوش :- وہی جو احمقوں کا ہوتا ہے۔

عذرا :- سو وہ کوئی احمق ہی ہوگا جو تم سے شادی کریگا —— یہ میری بات اچھی

طرح نوٹ کرلو ـــــ تم عقلمند ہوگئی ہو کہ کسی دوسرے کی عقل تم سے برداشت نہ ہو سکے گی۔

سنتوش :- عذرا دیکھو۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے یہ سارا چیپٹر زبانی یاد کرنا ہے جو کہنا ہو کہہ ڈالو اور جاؤ۔

(کرسی پر سے ٹانگیں ہٹا لیتی ہے۔ عذرا اس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عذرا :- توبہ ـــــ تم تو یہ چاہتی ہو کہ ادھر بٹن دباؤ اور ادھر ساری بات نکل کر باہر آ جائے ـــــ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اپنی عادت کے مطابق آہستہ ہی سب کچھ بتاؤں گی۔ تم بیٹھی پر وٹسٹ کرتی رہو۔

سنتوش :- لے اب جو کہنا ہے کہہ بھی ڈالو۔

عذرا :- ایک خط آیا ہے۔

سنتوش :- گھر سے ـــــ شادی وادی کی بابت؟

عذرا :- نہیں ـــــ اباجی دوسری شادی کر کے مجھے تو بالکل بھول ہی گئے ہیں اب اگر میں انہیں لکھوں "اباجی میرا جی چاہتا ہے کہ لاماؤں کی سرزمین تبت میں چلی جاؤں اور وہاں کسی خانقاہ میں راہبہ بنجاؤں تو وہ یقیناً خوش ہو کر جواب دیں گے "بیٹا یہ تمہارا خیال بہت ہی مبارک ہے"۔

سنتوش :- (ہنستی ہے) اس قدر نا امید نہیں ہونا چاہئے ـــــ ہاں تو خط اگر گھر سے نہیں آیا تو کہاں سے آیا ہے؟

عذرا :- جانے کہاں سے آیا ہے۔ پتا وتا تو درج نہیں ـــــ لفافے پر میرا نام ہے لیکن خطاب ہوسٹل کی تمام لڑکیوں سے کیا گیا ہے ـــــ میں

بھولی صرف خوبصورت لڑکیوں کے نام۔

سنتوش :- لکھنے والا کون ہے ؟

عذرا :- ایک مرد

سنتوش :- بالغ یا نابالغ ؟

عذرا :- معلوم نہیں۔ لیکن تحریر سے کافی بلوغت ٹپکتی ہے

سنتوش :- نام ؟

عذرا :- وہی ایک مرد۔

سنتوش :- اور ہمارے ہوسٹل میں بارہ لڑکیاں ہیں۔

عذرا :- بارہ نہیں تیرہ۔

سنتوش :- تیرہ کیسے۔

عذرا :- ایسے کہ اتفاق سے تم بھی لڑکی ہو۔

سنتوش :- تو ایک مرد نے ہم تیرہ لڑکیوں کے نام یہ خط بھیجا ہے۔

عذرا :- غلط — صرف اُن کے نام جو اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہوں۔

سنتوش :- اس کا مطلب ؟

عذرا :- (اپنے بلاؤز میں سے ایک خط انگلیوں کی مدد سے نکالتی ہے) تم یہ خط پڑھ لو۔

(خط سنتوش کو دے کر باہر جانے لگتی ہے)

سنتوش :- تم کہاں چلیں ؟

عذرا :- صفیہ کو بلا لاؤں۔

سنتوش :- صفیہ حسن کو۔

عذرا :- نہیں دوسری صفیہ کو ــــــ صفیہ حسن تو بیاہی ہوئی ہے۔ (وقفہ)
سنتوش میں کہتی ہوں ہوسٹلوں میں صرف بیاہی ہوئی عورتیں داخل کرنی چاہئیں
سنتوش :- کیوں؟
عذرا :- اس لئے کہ ہوسٹل ہسپتالوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور تم جانتی ہو کہ بیاہی ہوئی عورتیں اکثر بیمار رہتی ہیں (ہنستی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب ذرا تم بھی ہنس دو۔
سنتوش :- کسی کے کہنے پر میں کبھی نہیں ہنس سکتی۔
عذرا :- تو جہنم میں جاؤ ــــــ!

(چلی جاتی ہے)

سنتوش :- (خط پڑھتے ہوئے) ہاں۔ جاؤ۔ پر جلدی واپس آجانا۔

(کچھ دیر تک سنتوش خط پڑھنے میں مصروف رہتی ہے)

ورشا :- (آواز باہر سے آتی ہے) میں اندر آسکتی ہوں۔

(ورشا اور عذرا دونوں اندر داخل ہوتی ہیں)

عذرا :- آؤ۔ آؤ۔ ورشا آؤ ــــــ دیکھو تم یہاں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔
ورشا :- کیا بات ہے؟ ــــــ بڑی گھبرائی ہوئی ہو۔

(کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عذرا :- سنتوش سے پوچھو۔ وہ تمہیں سب کچھ بتادے گی۔

(چلی جاتی ہے)

ورشا :- یہ خط بڑی دلچسپی سے پڑھا جارہا ہے۔
سنتوش :- (سرگوشی میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) عذرا گئی۔

ورشا :- گئی ـــــ کیا بات ہے؟

سنتوش :- بتاتی ہوں ـــــ مجھے ایک شرارت سوجھی ہے۔

ورشا :- شرارت؟

سنتوش :- ہاں! شرارت۔ عذرا اور دوسری لڑکیاں ہمیشہ شکایت کرتی تھیں کہ میں بہت سنجیدہ اور متین ہوں۔ سو کل بیٹھے بیٹھے مجھے ایک شرارت سوجھی ـــــ کوئی سن تو نہیں رہا ہے ـــــ ہاں تو میں نے ایک شرارت کی اور یہ خط لکھ کر عذرا کے نام ڈال دیا ـــــ اب عذرا اس میں بڑی دلچسپی لے رہی ہے۔ میں تمہیں پوری بات سناتی پر کوئی آ جائیگا ـــــ یہ خط پڑھ لو

(خط اس کے حوالے کرتی ہے ـــــ اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

ورشا :- میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

سنتوش :- مجھے خود معلوم نہیں کہ خط لکھنے سے میرا مطلب کیا تھا ـــــ لیکن دیکھو ورشا کسی سے کہنا نہیں ورنہ سارا لطف جاتا رہے گا۔

ورشا :- (خط پڑھتے ہوئے) یہ تمہیں کیا سوجھی؟

سنتوش :- دراصل ورشا میں اپنی سنجیدگی اور متانت سے تنگ آ گئی ہوں جی چاہتا ہے کہ اب کوئی ہنگامہ ہو۔

ورشا :- (توقف کے بعد) ..... خط دلچسپ ہے۔

(غلام گردش سے تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور فوراً ہی عذرا آٹھ، دس لڑکیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوتی ہے)

عذرا :- ہے نا ـــــ میں ان سب سے ابھی ابھی کہہ رہی تھی۔

عذرا :- (لڑکیوں سے) آجاؤ۔ سب کی سب اندر چلی آؤ ــــ اختری تمہارا یہ
کھلاپن مجھے اچھا نہیں لگتا ــــ چلی آؤ ــــ تمہیں اپنی ناک
کی کیل سے جتنا پیار ہے اگر اتنا ہی مجھ سے ہوتا تو۔ . . . . . .

اختری :- تم ہر وقت میری اس کیل کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔

عذرا :- میں پوچھتی ہوں کہ بھلا کوئی یہ بھی زیوروں میں زیور ہے ــــ اچھی
بھلی ناک میں کیل گاڑ دی جاتی ہے اس کے ساتھ کیا تصویر لٹکاؤ گی۔

(کئی لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا :- (ہنستے ہوئے) آؤ۔ بھئی آؤ ــــ مذاق برطرف۔ اختری کی کیل سے
یہ خط زیادہ اہم ہے۔

(کچھ لڑکیاں کھڑی رہتی ہیں کچھ کرسیوں اور میزوں پر بیٹھ جاتی ہیں)

ورشا :- اہم وہم تو خاک بھی نہیں ــــ کوئی مرد ذرا سی بات کہہ دے تو تم اسے
خواہ مخواہ اہمیت دینا شروع کر دیتی ہو ــــ جانے نگوڑا کون ہے
کون نہیں ہے۔

عذرا :- تو چھوڑو ــــ خط میرے حوالے کرو۔ اتنی دلچسپی سے پڑھ کیوں رہی ہو۔
کتنی بھولی بنتی ہے۔ چہرے پر بالوں کی لٹیں ہر وقت یوں لٹکائے رکھتی ہے
جیسے میری بہو کو دنیا کا کچھ پتا ہی نہیں ــــ لاؤ خط مجھے دو (خط چھین لیتی ہے)

صفیہ :- (آگے بڑھ کر) . . . . یہ تم دونوں نے لڑنا کیوں شروع کر دیا ــــ
یہاں بلایا ہے تو کچھ ہمارے پلے بھی پڑے

عزت :- تم اب اپنا تھرکنا بند کرو ــــ تو یہ چلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے توڑے

لے رہی ہے ـــــ چلو اب خط سناؤ۔

عذرا :۔ تمہیں سننے کی کیا ضرورت ہے۔ اِس عینک میں سے تو تم لفافوں کے اندر کا مضمون بھی پڑھ لیا کرتی ہو۔

(بہت سی لڑکیوں کا شور ـــــ خط سنایا جائے۔ خط سنایا جائے)

عذرا :۔ (تقریر کے انداز میں) ..... خاموش ـــــ خاموش ـــــ درشا تم شنتو سے کیا کھُسر پھُسر کر رہی ہو؟ خاموش رہو ـــــ بہنو۔ میں نے تمہیں شنتو سں کے کمرے میں اس لئے بلایا ہے کہ مجھے آج ایک مرد کی طرف سے یہ خط وصول ہوا ہے۔

عزّت :۔ (خوش ہو کر) ..... ایک مرد کی طرف سے۔

نرملا :۔ اتنی خوش کیوں ہوتی ہو؟

عذرا :۔ خاموش ـــــ اس میں خوشی وشی کی کوئی بات نہیں ـــــ جو خط وصول ہوا ہے۔ میں آپ کو سنا دیتی ہوں خوشی اور غمی کا فیصلہ بعد میں کیا جائے! سرلا اور کملا تم دونوں بہنیں مجھے یوں گھور گھور کے کیوں دیکھ رہی ہو؟

سرلا اور کملا :۔ (دونوں) نہیں تو

عزّت :۔ عذرا۔ تم خط سناؤ۔

عذرا :۔ لو سنو ـــــ (خط کا کاغذ کھولتی ہے) ..... ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو ...... (لڑکیوں کی سرگوشیاں)

عذرا :۔ رشیدہ تم غور سے سنو ...... ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو ....

(اضطراب کی آوازیں)

عذرا :۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

خورشید :- رشیدہ کہتی ہے میں اب یہاں نہیں بیٹھوں گی۔

سنتوش :- عذرا تم نے اسے کیوں چھیڑا ـــــ کیا ہے بیچاری کی شکل میں۔
تم سے تو لاکھ درجے اچھی ہے۔

صفیّہ :- تم خط سناؤ جی۔ یہ بیکار کی باتیں کیا لے بیٹھی ہو۔

عذرا :- ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو ـــــ میری دعا ہے کہ شادی کے بعد بھی تمہاری خوبصورتی برقرار رہے۔

عزّت :- آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہے)

عذرا :- تم ضرور لفظ شادی سے گھبراؤ گی۔ تم میں سے بعض میں یہ گھبراہٹ اصلی ہو گی اور بعض میں مصنوعی۔ مرد مصنوعی اور اصلی گھبراہٹ پسند کرتے ہیں ـــ ضرور گھبراؤ ـــــ لیکن کاش تم شادی کے بعد بھی گھبرا سکتیں

اختری :- ہے ہے ـــ یہ نگوڑا کس قسم کا آدمی ہے ـــــ کیا اوٹ پٹانگ لکھا ہے۔ گھبراؤ ـــــ ضرور گھبراؤ۔

خورشید :- گھبرائے تمہاری بلا ـــــ تم تو اس دن کے انتظار میں......

اختری :- چپ کر موئی زبان دراز ـــــ

عذرا :- خاموش...... ہاں تو آگے لکھا ہے...... یہ خط میں صرف خوبصورت لڑکیوں کو لکھ رہا ہوں۔

(سرگوشیاں)

صفیّہ :- کیوں خوبصورت لڑکیاں کیا اس مردوے کی خالہ کی بھتیجی لگتی ہیں۔

اختری :- تم کیوں چڑتی ہو؟

عذرا :(خط پڑھتے ہوئے) یہ خط میں صرف خوبصورت لڑکیوں کو لکھ رہا ہوں اس کا جواب اگر مجھ سے طلب کیا جائے تو میں کہوں گا۔

سورن لتا :- کیا کہے گا؟

عذرا :- کہ عورت میں جیسے دنیا میں بڑے بڑے کام سرانجام دینا ہوتے ہیں خوبصورتی کا ہونا اشد ضروری ہے اگر عورت خوبصورت نہیں تو وہ ایسا کمرہ ہے جس میں کوئی روشندان نہ ہو۔

سرلا :- آگے کیا لکھا ہے؟

صفیہ :- آگے لکھا ہے تمہارا سر ـــــ ذرا اس کی طرف دیکھو۔ اختری کتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ موا گالیاں دے رہا ہے ـــــ اور یہ مزے سے سن رہی ہے

عذرا :- خوبصورتی ازدواجی زندگی کے تنفس کیلئے اشد ضروری ہے، یہ خط پڑھنے کے بعد تم میں سے اکثر اپنے آپ سے سوال کرینگی "کیا میں خوبصورت ہوں"۔

اختری :- صفیہ تو ضرور کرے گی۔

صفیہ :- پہلے میں اس یوسف کو نہ دیکھوں گی جو لوگوں کی خوبصورتی ناپتا پھرتا ہے۔

(تین چار لڑکیوں کی ہنسی)

عذرا :- تم میں سے اکثر بے وقوف لڑکیاں آئینے کی گواہی طلب کریں گی۔

صفیہ :- (غصے میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے) عذرا، اس سے کہو کہ منہ سنبھال کر بولے۔

(عذرا اور تین چار لڑکیوں کی ہنسی)

سنتوش :- آرڈر ـــــ آرڈر

عذرا :۔ (خط پڑھتے ہوئے) اپنے حافظہ پر زور دے کر ایسے واقعات تلاش کریگی جنھوں نے کبھی ان کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کیا ہوگا۔ سچ پوچھو تو عورت اپنی خوبصورتی یا بدصورتی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔۔۔۔ اسکی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کرنے والے ہم ہیں یعنی مرد۔

صفیہ :۔ گدھے کہیں کے

سنتوش :۔ تم بہت جلد بگڑ جاتی ہو۔

درشا :۔ (ہنس کر) اس قدر غصہ

صفیہ :۔ غصہ کیوں نہ آئے ـــــ بات ہی ایسی ہے ـــــ نامعقول کہیں کا ـــــ خیر بتاؤ آگے کیا لکھا ہے؟

عذرا :۔ تمہارے گالوں پر زخم کا نشان جو بظاہر بدصورت معلوم ہوتا ہے کسی مرد کی نگاہوں میں تمہاری خوبصورتی کا باعث ہو سکتا ہے (صفیہ اپنے گال کے داغ کو چھپا لیتی ہے) تمہارا توتلا پن۔ تمہارا تھوڑا سا لنگڑا کر چلنا۔ تمہارا ضرورت سے زیادہ بھولا پن جس سے شاید تمہارے ماں باپ نالاں ہوں۔ تمہارا ٹوٹا ہوا دانت تمہاری شکن آلودہ پیشانی، تمہارے موٹے ہونٹ جنکی بدصورتی کے متعلق دل ہی دل میں تم نے کئی بار سوچا ہوگا تمہیں خوبصورت بنانے میں بیش از بیش حصہ لے سکتے ہیں۔

رشیدہ :۔ (طنز کے ساتھ) تمہارے مڑے ہوئے دانت تمہاری تنگ پیشانی تمہارا کٹا ہوا بازو۔ تمہاری پھولی ہوئی توند۔ تمہاری گاجر برابر چوٹی اور تمہارے سوجے ہوئے نتھنے تمہیں خوبصورت بنانے میں بیش از بیش حصہ لے سکتے ہیں ـــــ مجھے تو

یہ کوئی بڑی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔

عذرا :- آگے سنو —— ہم آرٹسٹ ہیں یہی وجہ ہے کہ قدرت نے ہمیں صرف تمہارے پاس بھیجی ہے کہ ہم تمہاری نوک پلک نکالیں تمہیں خوبصورت بنائیں تمہارے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ تم خوبصورت ہو۔ اگر ہم نہ ہوتے تو بہت ممکن ہے چاند اور تارے تم پر بازی لے جاتے مگر چونکہ ہم ہیں اس لئے آسمانوں اور زمینوں کی تمام خوبصورتیاں نوچ کر ہم نے تمہارے قدموں میں ڈال رکھی ہیں۔

صفیہ :- محض بکواس ہے۔

نرملا :- خاموش بھی رہو۔

سرلا :- اس کی للّو تو بس چلتی رہتی ہے۔

عذرا :- تم اس ہوسٹل میں چار دیواری میں قید ہو۔ فلسفے، ہندسے اور معاشیات کی یہ موٹی موٹی کتابیں رٹتی رہتی ہو۔ تم میں سے کچھ فلسفے کی تیز شیشوں والی عینک ہر وقت اپنی ناک پر چڑھائے رکھتی ہیں —— میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ فلسفہ ولسفہ محض ڈھکوسلہ ہے۔ زماں و مکاں کی بحث بالکل لایعنی ہے معاشیات کے اصول کسی کام کے نہیں —— دنیا کے نظام پر صرف ایک چیز حکومت کرتی ہے صرف ایک چیز اور وہ عورت اور مرد کی ازلی دوستی ہے۔

اختری :- (بیخودی کے عالم میں) ازلی دوستی ہے۔

عذرا :- تم مردوں سے دور کیوں رہتی ہو؟ —— نہیں دور ہی رہو۔ اس لئے کہ تم دور رہنے پر زیادہ قریب آجاتی ہو مگر تم دور رہ کر خود کو قریب محسوس کیا کرو اس لئے کہ تمہارا یہ احساس اس قربت کا سارا لطف خراب کر دیتا ہے

اس احساس سے صرف مرد ہی لطف اندوز ہوں تو اچھا ہے۔

صفیہ :۔ دوری اور نزدیکی کا یہ گورکھ دھندا خوبصورت ہے۔

عذرا :۔ (شاعرانہ انداز میں) ..... رات کو سوتے وقت جب تمہارے کنوارے دماغ فلسفے معاشیات اور جبر و مقابلہ کی دھند سے آزاد ہوں تو اپنے کمرہ کی لطیف فضا میں جو تمہارے وجود سے اور بھی لطیف ہو جاتی ہے کچھ دیر کیلئے سوچنا کہ مرد کیا ہے ـــــ جب صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کالج جانے کیلئے زبردستی تمہاری مندی ہوئی آنکھیں کھولی جائیں گی اور تمہارا دل و دماغ نیند کی دُھنکی ہوئی رُوئی میں لپٹا ہوگا تو اس وقت بھی نیم غنودگی کی حالت میں سوچنا کہ مرد کیا ہے (خورشید انگڑائی لیتی ہے ..... اندھیری یا چاندنی راتوں میں جب تمہیں ہر شئے پُراسرار دکھائی دے گی اور ایک بے نام سا اضمحلال تم پر طاری ہوگا۔ اس وقت بھی تم اپنے نرم سیر دماغ سے پوچھنا "مرد کیا ہے"

عزت :۔ (بے خود ہو کر تالی بجاتی ہے) بہت خوب۔ بہت خوب

درشا :۔ سنتوش بھئی کچھ بھی ہو ـــــ فقرہ بہت خوبصورت ـــــ اندھیری یا چاندنی راتوں میں جب ہر شئے پُراسرار دکھائی دیگی اور ایک بے نام سا اضمحلال تم پر طاری ہوگا۔ اس وقت بھی اپنے نرم سیر دماغ سے پوچھنا! "مرد کیا ہے؟ ـــــ بہت اچھا فقرہ ہے۔

سنتوش :۔ (آہستہ) درشا ـــــ چُپ؟

عذرا :۔ ہوسٹل کی خوبصورت لڑکیو ـــــ وہ جو پھولوں میں نت نئے رنگ بھرتا ہے وہی تمہاری جوانیوں میں رنگ بھرے ـــــ اگر تم اس خط کا

جواب دینا چاہو تو لکھ کر اس بڑے پتھر کے نیچے رکھ دینا جو تمہارے ہوسٹل کی عمارت میں کام نہیں آسکا تھا۔ وہ جواب باہر سڑک پاس بیکار پڑا ہے ـــــ راقم ایک مرد

سرلا :- (افسوس کے ساتھ) خط ختم ہو گیا۔

صفیہ :- کیا کوئی ناول پڑھ کے سنایا جا رہا تھا تمہیں۔

عذرا :- خاموش ـــــ یہ تو خط آپ نے سن لیا۔ اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے سنتوش تمہاری کیا رائے ہے؟

بہت سی لڑکیاں :- ہاں پہلے سنتوش اپنی رائے ظاہر کرے۔

سنتوش :- رائے؟ ـــــ میں ـــــ میں کیا رائے دوں ـــــ تم جو فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہو گا۔

عزت :- عذرا ـــــ میری رائے میں اس خط کا جواب ضرور دینا چاہیئے اندھیری یا چاندنی راتوں میں صبح اٹھتے وقت یا رات کو سوتے وقت اپنے آپ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ مرد کیا ہے ـــــ میں سب جانتی ہوں کہ مرد کیا ہے۔

عذرا :- بتاؤ مرد کیا ہے؟

عزت :- مرد وہ جانور ہے جو کان رکھنے پر بھی دودھ نہیں دیتا ـــــ جیسا چمگادڑ

صفیہ حسن :- مجھے تمہارا یہ مذاق پسند نہیں آیا۔

عزت :- اس لئے کہ تم اسی قسم کی ایک چمگادڑ سے بیاہی ہو۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

بملا :- میرا اور سرلا کا خیال ہے کہ اس خط کا جواب ایسی ہی میٹھی زبان میں دینا چاہیئے

اختری :- تو اتنی شکر تم دونوں بہنوں کی زبان میں ہے۔
عذرا :- کمل تم خمیرے آٹے کی طرح پھیلی ہوئی کیا سوچ رہی ہو؟ کچھ تم بھی بولو۔
کمل :- میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔
عزت :- اسپرین کھاؤ
عذرا :- (خورشید کے پاس جا کر) خورشید تم اِن معاملوں میں بڑی ماہر ہو۔ بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟
خورشید :- (تنک کر) مجھے یہ چھیڑ خانی اچھی نہیں لگتی عذرا ——— (لہجہ بدل کر اختری سے)
اختری - خدا کی قسم جب سے اس نے یہ خط سنایا ہے میرا دل ڈر کے مارے دھک دھک کر رہا ہے ——— مجھے بڑی دہشت ہوتی ہے ایسی باتوں سے
اختری :- (مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ) میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ اپنے دل کا علاج کراؤ ——— ایسا نہ ہو کہ شادی کے روز مارے دہشت کے بند ہی ہو جائے۔
(تین چار لڑکیوں کی ہنسی)
عذرا :- نرملا تمہارا کیا خیال ہے؟
نرملا :- میں اس معاملہ میں اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتی ہوں
عزت :- رفریجریٹر میں رکھ چھوڑو۔
(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)
عذرا :- ورشا ——— میری بھولی بھولی ورشا تمہارا کیا خیال ہے؟
ورشا :- میرا خیال ہے کہ صفیہ سے پوچھا جائے۔
عذرا :- بولو صفیہ تمہاری کیا رائے ہے؟

صفیہ :- تم کہو گی کہ مجھے مردوں سے خداواسطے کا بیر ہے مگر سچ پوچھو تو اس خدا واسطے کے بیر کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا میری رائے ہے کہ ہم سب مل کر ایک محاذ بنا لیں اس مرد کا کھوج لگائیں۔ جب کھوج لگ جائے تو سب مل کر اس پر حملہ کر دیں ـــــ اگر آدمی اتفاق سے شریف نکل آیا تو ہم اسے معاف کر دیں گے ـــــ معاف کر دینے میں اور ہی لطف ہے۔

عذرا :- تمہارا مطلب ہے کہ ہم اُسے ماریں؟

صفیہ :- یقیناً یہی میرا مطلب ہے

سرلا اور بملا :- (دونوں بیک زبان) یہ صریحاً ظلم ہے۔

عزت :- مجھے بھی اس سے اتفاق نہیں ـــــ ممکن ہے بیچارے کے کہیں چوٹ آجائے تو تو بالکل ڈائن قصاں ہے۔

صفیہ :- میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔ مانو نہ مانو تمہارا اختیار ہے

عذرا تمہارا کیا خیال ہے؟

سرلا :- ہاں عذرا سے پوچھو اس کا کیا خیال ہے؟

عذرا :- تم سب کی رائے طلب کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ خط کا جواب نہیں دینا چاہئے لیکن دینا بھی چاہئے اس لئے کہ یہ ضروری ہے سو اس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ یہی خط اس پتھر کے نیچے رکھ دیا جائے ـــ کیا خیال ہے تمہارا عزت ـــــ میں سمجھتی ہوں کہ یہ طریقہ سب سے بہتر رہیگا یعنی اس میں کوئی قطعی جواب نہیں ہے ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔

عزت :- تمہارا خیال درست ہے۔

عذرا :- جنھیں یہ بات پسند ہے وہ اپنا ہاتھ کھڑا کر دیں۔

(چند لمحات سرگوشیاں ہوتی ہیں پھر سب لڑکیاں اپنا اپنا ہاتھ کھڑا کر دیتی ہیں)

عذرا :- سب راضی ہیں ——— سنتوش ——— تم نے ہاتھ کھڑا نہیں کیا؟

سنتوش :- میں سمجھی تھی کہ میں نے کر دیا ہوگا ——— لو ———

(ہاتھ کھڑا کر دیتی ہے)

عذرا :- تو یہ طے ہے ——— میرا پہلا پیریڈ خالی ہے میں ابھی جاکر یہ خط اس پتھر کے نیچے رکھ دیتی ہوں۔

سرلا :- لیکن شام کے چھ بجے پھر جاکے دیکھنا۔ ممکن ہے کوئی نئی بات .....

(گھنٹے کی آواز)

بہت سی لڑکیاں :- چلو ——— چلو ——— اب بھاگو ———

(لڑکیاں دروازے کی طرف بھاگتی ہیں صرف ورشا اور سنتوش کمرے میں جاتی ہیں)

سنتوش :- (جب ساری لڑکیاں باہر چلی جاتی ہیں تو آہستہ سے) ورشا ——— اب کیا ہوگا؟

ورشا :- (ہنس کر) کیا ہوگا ——— کچھ بھی نہیں ہوگا ——— مجھے تو تمہاری اس شرارت میں کچھ مزا نہیں آیا۔

سنتوش :- عذرا اس پتھر کے نیچے خط رکھ آئے گی۔

ورشا :- تم ایک گھنٹہ پہلے وہاں جاکر نکال لینا ——— اس میں گھبرانے کی بات ہی کیا ہے؟ ——— چلو اب چلیں۔

سنتوش :- چلو!

———(دونوں چلی جاتی ہیں)———

دوسرا منظر

(ہوسٹل کا وہی کمرہ جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ کلاک چھ بجاتا ہے۔ آہستہ آہستہ پردہ اُٹھتا ہے اور سنتوش اضطراب کے ساتھ ٹہلتی دکھائی دیتی ہے چند لمحات کے بعد ایک دم دروازہ کھلتا ہے۔)

سنتوش:- (پلٹ کر) کون؟

(ورشا اندر داخل ہوتی ہے)

ورشا:- کیا بات۔ اِس قدر پریشاں کیوں ہو؟ خط لے آئی ہو وہاں سے؟

سنتوش:- لے آئی ہوں —— لو پڑھ لو۔

ورشا:- صبح پڑھ تو لیا تھا۔

سنتوش:- نہیں یہ دوسرا ہے۔

ورشا:- کیا کوئی اور لکھا ہے؟

سنتوش:- نہیں۔ یہ سچ مچ کسی مرد کا لکھا ہوا ہے۔

ورشا:- ہائیں۔ یہ کیا ہوا؟

سنتوش:- کیا معلوم —— میں وہاں گئی تو پتھر کے نیچے میرے خط کے بجائے یہ کاغذ پڑا تھا۔

(نیا خط ورشا کو دیتی ہے)

ورشا:- (خط لے کر بیٹھ جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس عورت کے نام جس نے

ایک مرد کی دلی کیفیات بڑی کامیابی سے بیان کیں (سنتوش سے) تو وہ بھانپ گیا۔

سنتوش :- ظاہر ہے

(پھر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتی ہے۔)

ورشا :- کیا لکھا ہے؟ (پڑھتے ہوئے) اتفاق۔ ہاں۔ اتفاق سے تمہارا لکھا ہوا خط جو دل سے کم نازک نہیں۔ پتھر کے نیچے دبا ہوا ملا۔ میں نے اسکو نکالا اور پڑھا۔

سنتوش :- آہستہ پڑھو!

ورشا :- وہ مرد یقیناً خوش قسمت ہوگا جسے تمہاری رفاقت نصیب ہوگی! ——— اگر میں عورت ہوتا اور یہ خط واقعی کسی مرد کی جانب سے مجھے ملتا تو کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں کیا کرتا؟ (اپنی طرف سے) کوئی ضرورت نہیں (پھر خط پڑھتی ہے) تمہارے خط کا ایک ایک لفظ ایک ایک پنکھڑی ہے جو مجھے تمہارے ہی سانس کے زیر و بم سے لرزاں نظر آئی ——— آدمی شاعر معلوم ہوتا ہے۔

سنتوش :- آگے پڑھو!

ورشا :- میں پہلے عورت کو ایک حل نہ ہوسکنے والا معمّہ سمجھتا تھا۔ مگر تمہارے اس خط نے یہ مشکل آسان کر دی ہے۔ تمہارا خط۔ خط نہیں بلکہ عورت کی وہ انگڑائی ہے جس کے کھچاؤ نے نسوانیت کے سارے خطوط میرے سامنے نمایاں کر دیے ہیں۔ میں خوبصورت نہیں ——— اس بات کا

احساس مجھے ہمیشہ دکھ دیا کرتا تھا پر اب تمہارا خط پڑھ کر مجھے ڈھارس ہوئی ہے کہ مجھے خوبصورت بنانے والی کوئی نہ کوئی ہستی اس دنیا میں ضرور موجود ہے اور وہ ہستی عورت کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ ——— میں اس خط کا جواب نہیں چاہتا اس لئے کہ وہ بھی اس پتھر کے نیچے رکھ دیا جائیگا

——— راقم۔ ایک مرد۔

سنتوش :- اِدھر کونے پر کچھ اور بھی لکھا ہے (ورشا کو خط کا کونہ دکھاتی ہے)

ورشا :- (پڑھتی ہے) میں اپنے آپ کو چھپانا نہیں چاہتا۔ تم مجھے چھ بجے کے بعد پتھر کے آس پاس ٹہلتا دیکھ لوگی ——— چھ تو بج چکے ہیں اور تمہاری اس کھڑکی میں سے تو سب کچھ نظر آتا ہے وہ ——— وہ پتھر پڑا ہے۔

(کھڑکی میں سے باہر کوئی نظر نہیں آتا)

سنتوش :- آہستہ بولو کوئی سن لے گا۔

ورشا :- اگر اتنا ڈر تھا تو یہ خط وہاں سے اٹھایا ہی نہ ہوتا۔

سنتوش :- اُٹھا لیا تو بعد میں خیال آیا۔

ورشا :- تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ خط کون لکھ سکتا ہے؟

(اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے)

سنتوش :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— زیادہ حیران کرنے والی بات تو یہ ہے کہ اس پتھر کے نیچے اس کا ہاتھ کیسے پہنچ گیا ——— کیسی کیسی جگہ ان لوگوں کا ہاتھ پہنچ جاتا ہے۔

ورشا:خط اچھا ہے۔

سنتوش:۔ ہاں برا نہیں ـــــ پر ورشا کسی سے کہیو مت ـــــ اور دیکھو میں کیا کہہ رہی تھی ـــــ ہاں تو ایسا نہ کریں کہ اس پتھری کو یہاں سے اٹھوا دیں؟

ورشا:۔ اس سے کیا ہوگا؟

سنتوش:۔ ٹھیک ہے اس سے کیا ہو سکتا ہے؟ ـــــ ورشا؟

ورشا:۔ کیا؟

سنتوش:۔ اب کیا ہوگا ـــــ میرا خط اس کے پاس ہے

ورشا:۔ اور اس کا تمہارے پاس

سنتوش:۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ـــــ میں چاہتی ہوں کہ میرا خط مجھے واپس مل جائے ـــــ ورشا ـــــ دیکھو ـــــ ادھر دیکھو۔

کھڑکی میں سے دور ایک مرد دکھائی دیتا ہے

ورشا:۔ ہاں۔ ہاں ایک مرد۔ شاید وہی۔

(ورشا کمرے کے دوسرے حصے کی طرف جانا چاہتی ہے)

سنتوش:۔ کھڑکی کے پاس مت جاؤ۔ یہیں سے دیکھو (اُسے روک لیتی ہے اور آپ اُدھر کا رُخ کرتی ہے)

ورشا:۔ مجھے روکتی ہو اور آپ جا رہی ہو۔

سنتوش:۔ نہیں تو ـــــ لو میں بیٹھ جاتی ہوں۔ اُدھر سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن نظریں کھڑکی کی طرف لگی رہتی ہیں ـــــ ورشا اچھی

طرح سے نظر نہیں آتا۔
ورشا:۔ تمہاری نظر کمزور ہے۔
سنتوش:۔ (اپنے آپ پر جھنجھلا کر) عینک نہ جانے کب لگواؤں گی۔
ورشا:۔ صاف نظر آتا ہے یہاں سے۔
سنتوش:۔ (اُٹھ کر اشتیاق بھرے لہجہ میں) کیسا ہے؟
ورشا:۔ ٹھیرو! مجھے اچھی طرح دیکھ لینے دو ـــــ ہیٹ پہنے ہے
سنتوش:۔ یہ تو میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔
ورشا:۔ ہیٹ پہنے ہے قد چھوٹا ہے۔
سنتوش:۔ نہیں ورشا۔ اتنا چھوٹا نہیں۔
ورشا:۔ بھئی ـــــ میں تو اسے چھوٹا ہی کہوں گی۔ عورتوں کے لئے
اتنا قد ٹھیک ہے۔ پر مرد تو کچھ اونچے ہی ہونے چاہئیں۔
سنتوش:۔ اتنی دھوپ میں کھڑا ہے۔
ورشا:۔ پیٹھ ہماری طرف ہے۔
سنتوش:۔ ہاں یہ سوچنے کی بات ہے ـــــ اِدھر منہ کیوں نہیں کرتا
ورشا:۔ اُسے کیا معلوم کہ تمہارا کمرہ اِس طرف ہے۔
سنتوش:۔ ٹھیک ہے ـــــ پر ہوسٹل کی عمارت تو ادھر ہے اسے ادھر
ہی دیکھنا چاہیئے۔
ورشا:۔ ممکن ہے شرماتا ہو۔
سنتوش:۔ ورشا۔ اُسے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔

ورشا :- کیوں ؟

سنتوش :- بڑی بدنامی کی بات ہے ——— اگر کسی کو پتا لگ جائے تو ...... بھئی میرا دل دھک دھک کر رہا ہے (ورشا کا ہاتھ اُٹھا کر اپنے دل پر رکھتی ہے)

ورشا :- اس کو نہ دیکھو کھڑکی بند کر دو۔

سنتوش :- یہ بھی تو نہیں کر سکتی ——— ہوا ——— ہوا ——— ہوا بند ہو جائے گی۔

ورشا :- (شرارت کے ساتھ) ہاں ٹھیک کہتی ہو ——— سانس لینا دشوار ہو جائے گا۔

سنتوش :- کب ادھر منہ کرے گا ——— ورشا تم بھی مجھے کچھ نہیں بتاتی ہو۔ مرد اسی طرح پیٹھ کئے کھڑا رہتا ہے ——— دروازے میں سے چپکے عذرا اندر داخل ہو کر سنتوش اور ورشا کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے)

ورشا :- کیا بتاؤں تمہیں۔

عذرا :- (ایک دم) ...... یہ بتاؤ اس کا رنگ کیسا ہے؟ (دفعتہً سنتوش اور ورشا دونوں چونکتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کون ——— عذرا) ...... ناک نقشہ کیسا ہے ٹھوڑی کیسی؟ ہونٹ کیسے ہیں۔ لباس کیسا ہے طبیعت کیسی ہے۔ تو یہ سب باتیں کوئی مجھ سے پوچھے۔

سنتوش :- (کھسیانی ہنسی) ...... کہ ——— کہ کیسی باتیں؟

عذرا :- یہی معصوم باتیں کہ وہ کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے ــــــ بھئی ایسی باتیں معلوم کرنی ہی پڑتی ہیں۔

سنتوش :- میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ (ایک طرف ہٹ جاتی ہے)

عذرا :- اس کی کیا ضرورت ہے؟

سنتوش :- جانے کیا اوٹ پٹانگ بکتی ہو۔

عذرا :- ایسے بتے کسی اور کو دو ــــــ خط لکھ کر مقررہ وقت پر جب کوئی مرد بڑے بڑے پتھروں کے پاس ٹہلتا ہو تو کیسے معلوم نہیں ہو جاتا کہ بات پگھلنے والے موم کی ہے (ہنستی ہے) گھبرا کیوں گئیں؟

سنتوش :- (گھبرا کر) کیسا خط ــــــ پتھر ــــــ کونسا پتھر ــــــ میں ــــــ میں، کہاں ہے وہ مرد؟ ــــــ دیکھ لو ــــــ (مرد ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے)

عذرا :- تمہاری کھڑکی کے پاس چلا آئے گا گھبراتی کیوں ہو ــــــ میری بھولی بھالی ورشا تمہارا کیا خیال ہے؟

ورشا :- تم جانو اور یہ جانے۔ بھئی مجھے کچھ پتا نہیں۔

دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر دیکھنا شروع کر دیتی ہے

عذرا :- تمہاری مرضی۔

(کھڑکی پر دستک ہوتی ہے)

عذرا :- لو وہ آگیا۔

سنتوش :- (سخت گھبرا کر) اب میں کیا کروں ــــــ عذرا بر ماتما کیلئے

کچھ کرو ــــ میں ــــ میں ورشا ــــ ورشا ــــ
یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا؟ (پھر دستک ہوتی ہے)

عذرا :- ورشا اور عذرا کیا کرے ــــ اب اس سے ملو۔

سنتوش :- مگر عذرا میں نے اسے نہیں بلایا ــــ پہلا خط میں نے شرارت کے طور پر لکھا تھا۔ لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ سچ مچ کوئی مرد پتھر سے نکل آئے گا ــــ اب پرماتما کیلئے کچھ کرو

عذرا :- بھئی میں کچھ نہیں کر سکتی۔

(دستک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک)

آواز :- (کھڑکی میں سے آتی ہے) کیا میں سامنے آسکتا ہوں؟

عذرا :- آجاؤ۔

سنتوش :- یہ تم نے کیا غضب کیا؟

(بھاگنے لگتی ہے لیکن عذرا اُسے پکڑ لیتی ہے)

عذرا :- خاموش رہو۔

(چند لمحات مکمل خاموشی میں گذرتے ہیں۔ پھر ایکدم صفیہ کھڑکی میں سے نظر آتی ہے مردانہ کپڑے پہنے۔)

صفیہ :- (شرارت کے ساتھ) آداب عرض کرتا ہوں

سنتوش :- کون؟ صفیہ!

عذرا :- صفیہ نہیں ــــ ایک مرد

صفیہ :- بھئی سنتوش۔ ۲۱ ہیں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ مجھے مردوں کا

لباس پہنا کر پتھر کے پاس کھڑا کرنے والی عذرا ہے۔

سنتوش :- تو —— تو —— یہ خط ......؟

عذرا :- میں نے لکھا تھا —— جس طرح پہلا خط تم نے لکھا تھا۔

(سب قہقہے لگاتی ہیں)

(بہت سی لڑکیاں ایک دم اندر داخل ہوتی ہیں اور شور مچانا شروع کردیتی ہیں۔ سنتوش اُن میں گھر جاتی ہے۔

پردہ

شادی کے ایک مہینے بعد سہیل پریشان ہوگیا۔ اس کی راتوں
کی نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا۔

اس کا خیال تھا کہ بچہ کم از کم تین سال کے بعد پیدا ہوگا مگر اب
ایک دم یہ معلوم کر کے اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس بچے کا اُس کو
وہم و گمان بھی نہیں تھا اس کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی
اتنی جلدی ماں بننے کا شوق نہیں تھا اور سچ پوچھئے تو وہ ابھی خود بچہ
تھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر کیا ہوتی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نائشہ
گڑیاں کھیلتی تھی اور صرف پانچ مہینے کی بات ہے کہ سہیل نے اسے گلی میں جنگلی
بلی کی طرح نکلے چبولں پر خوانچے والے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ منہ لال کئے
وہ اس سے کہہ رہی تھی "تم نے مجھے کل بھی کھیلیں اسی طرح کم کر دی تھیں
تم بے ایمان ہو —— میرے پیسے کیا مفت کے آتے ہیں جو میں تول میں ہر
بار کم چیز لے لوں۔" اور اس نے زبردستی جھپٹا مار کر مٹھی بھر نمکین چنے اس کے

خوانچے سے اٹھا لئے تھے۔

اب سہیل یہ منظر یاد کرتا اور سوچتا کہ عائشہ کی گود میں بچہ ہوگا جب وہ گھر جاتے ہوئے ٹرین کا سفر کرے گی تو اپنے اس ننھے کو اسی طرح دودھ پلائے گی جس طرح ریل کے ڈبوں میں دوسری عورتیں پلایا کرتی ہیں ــــــ اس کی لڑکی یا لڑکا اسی طرح چسر چسر کرے گا۔ اسی طرح ہونٹ سکیڑ کر روئے گا، تو وہ عائشہ سے کہے گا۔ "بچہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے اور تم کھڑکی میں سے باہر کا تماشہ دیکھ رہی ہو" ــــــ اُس کا تصور کرتے ہی سہیل کا حلق سوکھ جاتا ہے۔

"اس عمر میں بچہ؟ ــــــ بھئی میرا تو ستیاناس ہو جائے گا ــــــ ساری شاعری تباہ ہو جائے گی۔ وہ ماں بنجائے گی، میں باپ بنجاؤں گا۔ شادی کا باقی رہے گا کیا؟ ــــــ صرف ایک مہینہ جس میں ہم دونوں میاں بیوی بن کے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اولاد کا سلسلہ کیوں میاں بیوی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد بُری چیز ہے۔ بچے پیدا ہوں پر اُس وقت جب اُنکی خواہش کیجائے یہ نہیں کہ بن بلائے مہمانوں کی طرح آن ٹپکیں۔ میں خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ کیسے کیسے حسین خیال میرے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ شروع شروع کے دن تو ایک عجیب قسم کی افراتفری میں گزرے تھے، اب ایک مہینے کے بعد سب چیز وں کی نوک پلک درست ہوئی تھی۔ اب شادی کا اصلی لطف آنے لگا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ آفت آ گئی ــــــ ابھی جانے کتنے اور ہوں۔"

سہیل پریشان ہو گیا۔ اگر دفعتہً آسمان سے کوئی جہاز بم برسانا شروع کر دیتا تو وہ اس قدر پریشان نہ ہوتا مگر اس حادثے نے اس کا دماغی توازن درہم برہم

کردیا تھا۔ وہ اتنی جلدی باپ نہیں بننا چاہتا تھا۔

"میں اگر باپ بن جاؤں تو کوئی ہرج نہیں مگر مصیبت یہ کہ عائشہ ماں بنجائے گی ـــــ اسکو اتنی جلدی ہرگز ہرگز ماں نہیں بننا چاہیئے۔ وہ جوانی کہاں رہے گی اس کی جسکو میں اب بھی شادی ہونے کے بعد بھی کنکھیوں سے دیکھتا ہوں اور ایک لرزش سی اپنے خیالات میں محسوس کرتا ہوں۔ اسکی تیزی و طرّاری کہاں رہے گی ـــــ وہ بھولا پن جو اب مجھے عائشہ میں نظر آتا ہے ماں بن کر بالکل غائب ہوجائے گا۔ وہ کھلنڈرا پن جو اس کی رگوں میں پھڑکتا ہے مُردہ ہوجائے گا ـــــ وہ ماں بن جائے گی، اور صابن کے جھاگ کی طرح اس کی تمام چلبلاہٹیں بیٹھ جائینگی ـــــ گود میں ایک چھوٹے سے روتے پلّے کو لئے کبھی وہ میز پر پیپر ویٹ اٹھا کر بجائے گی، کبھی کنڈی ہلائے گی اور کبھی کن سری تانوں میں اوٹ پٹانگ لوریاں سنائے گی ـــــ واللہ میں تو پاگل ہوجاؤں گا۔"

سہیل کو دیوانگی کی حد تک اس حادثے نے پریشان کر رکھا تھا۔ تین چار دن تک اس کی پریشانی کا کسی کو علم نہ ہوا، مگر اس کے بعد جب اس کا چہرہ فکر و تردد کے باعث مرجھا سا گیا تو ایک دن اس کی ماں نے کہا "سہیل کیا بات ہے آج کل تم بہت اُداس اُداس رہتے ہو۔"

سہیل نے جواب دیا "کوئی بات نہیں امّی جان ـــــ موسم ہی کچھ ایسا ہے۔" ـــــ موسم بے حد اچھا تھا، ہوا میں لطافت تھی۔ وکٹوریہ گارڈن میں جب وہ سیر کے لئے گیا تو اُسے بیشمار پھول کھلے ہوئے نظر آئے تھے۔ ہر رنگ کے ہر بادل بھی عام تھے درختوں کے پتے اب مٹیالے نہیں تھے ہر شئے دُھلی ہوئی نظر آتی تھی مگر سہیل نے اپنی

اُداسی کا باعث موسم کی خرابی بتایا۔
ماں نے جب یہ بات سُنی تو کہا "سہیل تو مجھ سے چھپاتا ہے ـــ دیکھ سچ سچ بتا کیا بات ہے ـــ عائشہ نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی"
سہیل کے جی میں آئی کہ اپنی ماں سے کہہ دے "ایسی ویسی بات؟ ـــ امّی جان اُس نے ایسی بات کی ہے کہ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے ـــ مجھ سے پوچھے بغیر اُس نے ماں بننے کا ارادہ کر لیا ہے" مگر اس نے یہ بات نہ کہی اس لئے کہ یہ سن کر اس کی ماں یقینی طور پر خوش ہوتی۔
"نہیں امّی جان۔ عائشہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ سے تو اُسے بے پناہ محبت ہے ـــ دراصل میری اداسی کا باعث ـــ لیکن امّی جان میں تو بہت خوش ہوں۔
یہ سُن کر اُس کی ماں نے دعائیہ لہجے میں کہا "اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے عائشہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے ـــ میں تو اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں ـــ اچھا، پر سہیل یہ تو بتا اب میرے دل کی مُراد کب پوری ہو گی"
سہیل نے مصنوعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"
"تو سب سمجھتا ہے ـــ میں پوچھتی ہوں کب تیرا لڑکا میری گود میں کھیلے گا۔ سہیل دل کی ایک آرزو تھی کہ تجھے دولہا بنتا دیکھوں، سو یہ آرزو خدا نے پوری کر دی۔ اب اِس بات کی تمنا ہے کہ تجھے پھلتا پھولتا بھی دیکھوں۔"

سہیل نے اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔" امی جان آپ تو ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ دو برس تک میں بالکل اولاد نہیں چاہتا۔"

" دو برس تک تو۔ بالکل اولاد نہیں چاہتا، کیسے؟ — یعنی تو اگر نہیں چاہے گا تو بھی بچہ نہیں ہوگا؟ — واہ! ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے۔ — اولاد دینا نہ دینا اس کے ہاتھ میں ہے اور ضرور دیگا — اللہ کے حکم سے کل ہی میری گود میں پوتا کھیل رہا ہوگا۔"

سہیل نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ کہتا بھی کیا۔ اگر وہ اپنی ماں کو بتا دیتا کہ عائشہ حاملہ ہو چکی ہے تو ظاہر ہے کہ سارا راز فاش ہو جاتا اور وہ بچے کی پیدائش روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ شروع شروع میں اس نے سوچا تھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے سنا تھا کہ عورتوں کے حساب وکتاب میں کبھی کبھی ایسا ہیر پھیر ہو جایا کرتا ہے ابھی تک یہ خیال اس کے دماغ میں جما ہوا تھا۔ اس کے موہوم ہونے پر بھی اس کو امید تھی کہ چند ہی دنوں میں مطلع صاف ہو جائے گا۔

پندرہ بیس دن گذر گئے مگر مطلع صاف نہ ہوا، اب اسکی پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ وہ جب بھولی بھالی عائشہ کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی مداری کے تھیلے کی طرف دیکھ رہا ہے۔" آج عائشہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ کتنی اچھی لگتی ہے لیکن مہینوں میں اس کا پیٹ پھول کر تھیلیا بن جائے گا۔ ہاتھ پیر سوج جائیں گے — ہوائیں عجیب عجیب خوشبوئیں اڑ

اور بدبوئیں سونگھتی پھرتی ۔ قے کرتی اور خدا معلوم کیا سے کیا بنجائیگی!"

سہیل نے اپنی پریشانی ماں سے چھپائے رکھی، بہن کو بھی پتہ نہ چلنے دیا مگر بیوی کو معلوم ہو ہی گیا۔ ایک روز سونے سے پہلے عائشہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں اس سے کہا۔ "کچھ دنوں سے آپ مجھے بے حد مضطرب نظر آتے ہیں ــــ کیا وجہ ہے؟"

لطف یہ ہے کہ عائشہ کو کچھ معلوم نہیں تھا ایک دو بار اس نے سہیل سے کہا تھا کہ یہ اب کی دفعہ کیا ہو گیا ہے تو سہیل نے بات گول مول کر دی تھی اور کہا تھا کہ شادی کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں ممکن ہے کوئی ایسی ہی تبدیلی ہو گئی ہو" مگر اب اسے سچی بات بتانا ہی پڑی "عائشہ میں اس لئے پریشان ہوں کہ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم اب ماں بننے والی ہو"

عائشہ شرما گئی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"

"کیسی باتیں کرتا ہوں ۔ اب جو حقیقت ہے میں نے تم سے کہدی ہے تمہارے لئے یہ خوشخبری ہو گی مگر خدا کی قسم اس نے مجھے کئی دنوں سے پاگل بنا رکھا ہے"

عائشہ نے جب سہیل کو سنجیدہ دیکھا تو کہا "تو ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ کیا سچ مچ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں، ہاں ــــ سچ مچ ــــ تم ماں بننے والی ہو ــــ خدا کی قسم جب میں سوچتا ہوں کہ چند مہینوں ہی میں تم کچھ اور ہی بنجاؤگی تو میرے دماغ میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے ــــ میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بچہ

پیدا ہوا ب خدا کے لئے تم کچھ کرو۔"

عائشہ یہ بات سنکر صرف محجوب سی ہو گئی تھی۔ حجاب کے علاوہ اس نے ہونے والے بچے کے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ دراصل یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکی تھی کہ اُسے خوش ہونا چاہئے یا گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہئے اس کو معلوم تھا کہ جب شادی ہوئی ہے تو بچہ ضرور پیدا ہو گا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سہیل اتنا پریشان ہو جائے گا۔

سہیل نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔ اب سوچتی کیا ہو۔ کچھ کرو تاکہ اُس بچے کی مصیبت ٹلے۔"

عائشہ دل ہی دل میں ہونے والے بچے کے ننھے ننھے کپڑوں کے متعلق سوچ رہی تھی، سہیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

کیا کہا ؟"

"میں کہتا ہوں کچھ بند و بست کرو کہ یہ بچہ پیدا نہ ہو۔"

"بتائیے میں کیا کروں ؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں کہتا۔ تم عورت ہو۔ عورتوں سے ملتی رہی ہو۔ شادی پر تمہاری بیاہی ہوئی سہیلیوں نے تمہیں کئی مشورے دیئے ہونگے یاد کرو، کسی سے پوچھو۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو ضرور ہو گی۔"

عائشہ نے اپنے حافظہ پر زور دیا۔ مگر اسے کوئی ایسی ترکیب یاد نہ آئی مجھے تو آج تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا پر میں پوچھتی ہوں کہ اتنے دن آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہا۔ جب بھی میں نے آپ سے اس

بارے میں بات چیت کی آپ نے ٹال دیا۔"

"میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید میرا واہمہ ہو، پر اب کہ بات بالکل پکی ہو گئی ہے۔ تمہیں بتانا ہی پڑا۔ عائشہ اگر اس کا کوئی علاج نہ ہوا تو خدا کی قسم بہت بڑی آفت آجائے گی۔ آدمی شادی کرتا ہے کہ چند برس ہنسی خوشی میں گزارے، یہ نہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں۔ جھٹ سے ایک بچہ پیدا ہو جائے ــــــ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیتا ہوں۔"

عائشہ نے جواب دماغی طور پر سہیل کی پریشانی میں شریک ہو چکی تھی کہا "ہاں، کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لینا چاہئیے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ بچہ اتنی جلدی نہ ہو۔"

سہیل نے سوچنا شروع کیا۔ پولینڈ کا ایک ڈاکٹر اس کا واقف تھا، پچھلے دنوں جب شراب کی بندش ہوئی تھی تو وہ اس ڈاکٹر کے ذریعہ ہی سے وسکی حاصل کرتا تھا۔ پر اب وہ دیولالی میں نظر بند تھا۔ کیونکہ حکومت کو اس کی حرکات وسکنات پر شبہ ہو گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر اگر نظر بند نہ ہوتا تو یقیناً سہیل کا کام کر دیتا۔ اس پولستانی ڈاکٹر کے علاوہ ایک یہودی ڈاکٹر کو بھی وہ جانتا تھا جس سے اس نے اپنی چھاتی کے درد کا علاج کرایا تھا۔ سہیل اس کے پاس چلا جاتا مگر اس کا چہرہ اتنا رعب دار تھا کہ وہ اس سے ایسی بات کے متعلق ارادے کے باوجود مشورہ نہ لے سکتا۔

یوں تو بمبئی میں ہزاروں ڈاکٹر موجود تھے مگر بغیر واقفیت اس معاملے کے متعلق بات چیت ناممکن تھی ــــــ بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد معاً

اس کو مس فریا کا خیال آیا جو ناگپاڑے میں پریکٹس کرتی تھی اور اس کا خیال آتے ہی مس فریا اس کے آنکھوں کے سامنے آگئی۔

موٹے اور بھاری جسم کی یہ کرسچین عورت عجیب و غریب کپڑے پہنتی تھی ناگپاڑے میں کئی یہودی، کرسچین اور پارسی لڑکیاں رہتی ہیں سہیل نے ان کو ہمیشہ چست اور شوخ رنگ لباسوں میں دیکھا تھا۔ سکرٹ گھٹنوں سے ذرا نیچی، ننگی پنڈلیاں، اونچی ایڑی کی سینڈل۔ سر کے بال کٹے ہوئے، ان میں لہریں پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے، ہونٹوں پر گاڑی سرخی، گالوں پر اڑے اڑے رنگ کا غازہ بھویں مونڈ کر تیکھی بنائی ہوئی۔ ان لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ نگاہیں۔ ان چیزوں کو پہلے دیکھتی تھیں جن سے عورت بنتی ہے، مگر مس فریا ٹخنوں تک لمبا ڈھیلا ڈھالا فراک پہنتی تھی پنڈلیاں ہمیشہ موٹی جرابوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ شو پہنتی تھی بہت ہی پرانے فیشن کا بال کٹے ہوئے تھے مگر ان میں لہریں پیدا کرنے کی طرف وہ کبھی توجہ ہی نہیں دیتی تھی اس بے توجہی کے باعث اس کے بالوں میں ایک عجیب قسم کی بے جانی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی رنگ کالا تھا جو کبھی کبھی سنولاہٹ بھی اختیار کر لیتا تھا۔

عائشہ نے تھوڑی دیر تک بچے کی پیدائش کے متعلق غور کیا اور سہیل کے پہلو میں سو گئی۔ غور و فکر ہمیشہ اس کو سلا دیا کرتا تھا۔

عائشہ سو گئی مگر سہیل جاگتا رہا اور مس فریا کے متعلق سوچتا رہا۔

ٹھیک ایک برس پہلے انہی دنوں میں جب اس کے کمرے میں نہ یہ دنیا

پلنگ تھا جو عائشہ جہیز میں لائی تھی! اور نہ خود عائشہ تھی تو سہیل نے ایک بار
مس فریا کو خاص زاویئے سے دیکھا تھا۔ سہیل کی بہن کے ہاں بچہ پیدا
ہونے والا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بچہ کب پیدا ہوگا۔ مس فریا کو بلایا
گیا تھا۔ سہیل تازہ تازہ بمبئی آیا تھا۔ ناگپاڑے کی شوخ تیتریاں دیکھ دیکھ
کر جو بالکل اس کے پاس سے پھڑ پھڑاتی ہوئی گزر جاتی تھیں اس کے دل میں
یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ان سب کو پکڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے مگر
جب یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ ناامیدی کی حد تک پہنچ گیا تو اُسے
مس فریا دکھائی دی۔

پہلی نظر میں سہیل کے جمالیاتی ذوق کو صدمہ سا پہنچا ــــ کیسی بے ڈول
عورت ہے ــــ لباس کیسا بیہودہ ہے اور قد...... تھوڑے ہی
دنوں میں بھینس بن جائے گی۔"

مس فریا نے اس روز کالے رنگ کی جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی،
جس میں تین چار شوخ رنگ کے پھندنے لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کیچڑ
میں آلوچے گر پڑے ہیں۔ فراک جو ٹخنوں تک بڑے اُداس انداز میں لٹک
رہا تھا چھپی ہوئی جارجیٹ کا تھا۔ پھول خوشنما تھے، کپڑا بھی اچھا تھا مگر
بہت ہی بھونڈے طریقے پر سیا گیا تھا

مس فریا جب دوسرے کمرے سے فارغ ہو کر آئی تو اُس نے سہیل سے
انگریزی میں کہا۔ "غسل خانہ کدھر ہے۔ مجھے ہاتھ دھونے ہیں۔"
غسل خانے میں سہیل نے مس فریا کو بہت قریب سے دیکھا تو اسے نسوانیت

کے کئی ذرّے اُس کے ساتھ چمٹے ہوئے نظر آئے۔ سہیل نے اب اُسے پسند کرنے کی نیت سے دیکھنا شروع کیا۔ "بُری نہیں ——— آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میک اپ نہیں کرتی تو کیا ہوا۔ ٹھیک ہے۔ ہاتھ کیسے اچھے ہیں۔"

مس فریا کے بالائی ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ کام کرنے کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ سہیل نے جب انکی طرف دیکھا تو مس فریا اُسے پسند آ گئی۔ پسینے کی یہ پھوار سی جو اس کی مونچھوں کی روئیں پر کیکپا رہی تھی اُسے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔ سہیل کے جی میں آئی کہ وہ کچھ کرنا شروع کر دے جس سے اس کا سارا جسم عرق آلود ہو جائے۔

مس فریا جب ہاتھ پونچھ کر فارغ ہو گئی تو اس نے سہیل کی ماں سے کہا۔ "آپ ان کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ میں دوا تیار کر کے دے دونگی اور استعمال کرنے کی ترکیب بھی سمجھا دونگی۔"

ناگپاڑے تک جہاں وہ پریکٹس کرتی تھی، وکٹوریہ میں سہیل نے اُس سے کوئی خاص بات نہ کی۔ کونین کے متعلق اُس نے چند باتیں دریافت کیں کہ ملیریا میں کتنی مقدار اسکی کھانی چاہیے۔ پھر اس نے دانتوں کی صفائی کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ اتنے میں وہ جگہ آ گئی جہاں مس فریا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا بورڈ لٹکا رہتا تھا۔

پہلی منزل کے ایک کمرے میں مس فریا کا مطب تھا۔ اس کمرے کے دو حصّے کئے گئے تھے، ایک حصے میں مس فریا کی میز تھی جہاں وہ عام طور پر

بیٹھی تھی۔ دوسرے حصے میں اس کی ڈسپنسری تھی۔ ڈسپنسری کی دو الماریوں کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا تخت بھی تھا جس پر غالباً وہ مریض لٹا کر دیکھا کرتی تھی۔

مس فریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اتار دی اور ایک کیل پر لٹکا دی۔ سہیل اس بنچ پر بیٹھ گیا جو میز کے پاس بچھی تھی۔ ٹوپی اتار کر مس فریا نے نیم انگریزی اور نیم ہندوستانی لہجہ میں آواز دی، "چھوکرا۔۔۔۔" کمرے کے دوسرے حصے سے ایک مریل سا آدمی نکل آیا اور کہنے لگا۔ "ہاں میم صاحب"۔

میم صاحب کچھ نہ بولیں اور دوا بنانے کے لئے اندر چلی گئیں سہیل اس دوران میں سوچتا رہا کہ مس فریا سے کسی طرح دوستی پیدا کرنا چاہیے وہ تھوڑا سا وقت جو اُسے ملا اسی سوچ بچار میں خرچ ہو گیا اور مس فریا دوا بنا کر لے آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے شیشی پر گوند سے لیبل چپکایا اور پڑیوں پر نمبر لگانے کے بعد کہا۔ "یہ دو دوائیں ہیں۔ پڑیا ابھی جا کر پانی کے ساتھ دے دیجئے اور اس میں سے ایک خوراک آدھے گھنٹے کے بعد پلا دیجئے گا۔ پھر ہر تین گھنٹے کے بعد اسی طرح"۔

سہیل نے پڑیاں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔ شیشی ہاتھ میں لے لی، اور مس فریا کی طرف کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ گھبرا گئی "۔۔۔ آپ بھول تو نہیں گئے"۔

سہیل نے اسی انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بھولا نہیں

مجھے سب کچھ یاد ہے۔"

مس فریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ "تو...... تو...... ٹھیک ہے......"

سہیل دراصل اپنے ارادہ کو مکمل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

مس فریا نے چند کاغذات اٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دیئے "اس کے...... اُس کے دام؟"

سہیل نے خاموشی سے بٹوہ نکالا۔ "کتنے ہوئے" یہ کہہ کر اس نے پانچ کا نوٹ بڑھا دیا۔

مس فریا نے نوٹ لیا۔ میز کی دراز کھولکر اس میں رکھا۔ جلدی جلدی ریزگاری نکالی اور حساب کر کے باقی پیسے سہیل کی طرف بڑھا دیئے۔

سہیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے کہا۔ "تمہارا ہاتھ کتنا خوبصورت ہے۔"

مس فریا تھوڑی دیر تک فیصلہ نہ کر سکی کہ اُسے کیا کرنا چاہئے "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

سہیل نے بڑے ہی خام انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جیسے وہ اسٹیج پر عشقیہ پارٹ ادا کر رہا ہے۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

سہیل کو جب مس فریا کے لہجے میں کھردراپن محسوس ہوا تو وہ چونکا

اُس نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ اینگلو انڈین اور کرسچین لڑکیاں فوراً ہی پھنس جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ اسی سنی سنائی بات کے زیر اثر اس نے اتنی جراءت کی تھی مگر یہاں جب اسے معاملہ بالکل برعکس نظر آیا تو اس نے جلدی سے دوا کی شیشی اٹھائی اور کہا۔ "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں دراصل مجھے آپ سے ایسی فضول باتیں نہیں کرنا چاہئے تھیں.... میں .... میں نہ جانے کیا بک گیا۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

مس فریا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا غصہ کچھ کم ہو گیا۔ "تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے بے حد غصہ آیا تھا مگر میں اب تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو مجھے تم بہت ہی معصوم نظر آتے ہو ــــــ بیوقوفی کی حد تک معصوم، جاؤ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔"

سہیل سہم سا گیا۔ مس فریا کو وہ اسکول کی استانی سمجھنے لگا۔ "آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔"

مس فریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا نہ ہوئی جو سہیل چاہتا تھا کہ پیدا ہو۔ "جاؤ میں نے کہہ دیا کہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا ــــــ دوا کسی اور جگہ سے نہ لینا۔ کل یہیں چلے آنا ــــــ اور دیکھو تم نے میرے آنے جانے کے پیسے نہیں دیئے۔"

سہیل نے پوچھا۔ "کتنے ہوتے ہیں۔"

"بارہ آنے۔"

سہیل نے بارہ آنے میز پر رکھ دیئے اور جب وہ بازار میں پہونچا تو اسے

خیال کیا کہ وکٹوریہ والے کو تو وہ بارہ آنے ادا کر چکا تھا لیکن اس نے سوچا کہ چلو بلا ٹل گئی ہے، کیا ہوا اگر بارہ آنے زیادہ چلے گئے۔

سہیل کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ امرتسر میں وہ کئی لڑکیوں سے ایسی اور اس سے بھی سخت جھڑکیاں کھا چکا تھا۔ چند گھنٹوں تک اس واقعہ کا سہیل پر بہت ہی زیادہ اثر رہا۔ لیکن جب وہ دوسرے دن مس فریا کے ہاں دوا لینے کے لئے گیا اس نے دوسرے گاہکوں کی طرح اس سے بلا جھجک بات چیت کی تو وہ شرمندگی جس کا تھوڑا سا احساس باقی رہ گیا تھا دور ہو گئی۔

دس بارہ روز تک وہ متواتر دوا لینے کے لئے مس فریا کے ہاں جاتا رہا اس دوران میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے سہیل کے دماغ میں اس خفت انگیز واقعہ کی یاد تازہ ہوتی اس کے بعد اسکی بہن تندرست ہو گئی اور مس فریا اس عرصہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اب ایک دم بارہ تیرہ مہینے کے بعد سہیل کو اس کا خیال آیا اور اس نے اس سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا۔ "عورت کو روپئے پیسے کا بہت لالچ ہے میرا خیال ہے کہ وہ ضرور اس معاملہ میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو جائے گی اور پھر اس واقعہ کو اس بات سے کیا تعلق ہے۔ اگر وہ میرا کام کر دے گی تو میں اسے منہ مانگے دام ادا کر دوں گا۔"

دوسرے روز شام کو وہ مس فریا کے پاس گیا۔ سہیل کو دیکھ کر اس نے بڑے کاروباری انداز میں کہا "بہت مدت کے بعد تشریف لائے۔"

سہیل شادی کے بعد اب کافی تبدیل ہو چکا تھا آرام سے بنچ پر بیٹھ

گیا اور کہنے لگا اس دوران میں کوئی بیمار نہیں ہوا اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

مس فریا مسکرائی "اب کیسے آنا ہوا۔"

سہیل نے جواب دیا "میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں ———"

مس فریا نے اور زیادہ متوجہ ہو کر پوچھا "آپ کی شادی ہو گئی"

"جی ہاں ——— ہو گئی۔"

"کب ہوئی"

"ایک مہینہ پہلے"

"صرف ایک مہینہ"

مس فریا نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا "کیسی ہے آپکی بیوی"۔

سہیل نے بالکل رسمی انداز میں جواب دیا "بہت اچھی ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ ...... کہ ...... خوبصورت ہے؟ ——— ضرور خوبصورت ہو گی۔ پنجاب کی لڑکیاں عام طور پر خوبصورت ہوتی ہیں۔"

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا چہرے پر اس نے پوڈر لگا رکھا تھا جس سے رنگ بہت ہی بدنما ہو گیا تھا۔ بال خشک اور بے جان تھے فراک بھی نہایت بھونڈا تھا جب اس نے عائشہ کا خیال کیا تو فریا اسے بھنگن معلوم ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا اور پرانا بدلہ لینے کی خاطر اس نے کہا "میری بیوی بہت خوبصورت ہے۔ تم اسے دیکھو گی تو

پتہ چلے گا۔

مس فریا نے شاید یہ بات نہ سُنی، کیونکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی
"تو ایک ہفتے سے تم عیش کر رہے ہو۔"

سہیل نے پھر اُسے جلانے کے لئے کہا "انسان کو زندگی میں ایک بار ہی ایسا موقع ملتا ہے۔ کیوں نہ اُس سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

"ہاں، ہاں ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ ... مگر ... مگر زیادہ نہیں ... تم ضرور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہو گے"

مس فریا کے لہجے میں ایک عجیب قسم کی للچاہٹ تھی۔

سہیل کو اس گفتگو میں مزہ آنے لگا مسکرا کر اس نے کہا "زیادہ سے زیادہ کیوں نہ اٹھایا جائے ——— یہی وقت تو ہے کبھی بھر کے لطف اٹھایا جائے بیوی اچھی ہو۔ طبیعتیں آپس میں مل جائیں ——— جوانی ہو۔ حالات سازگار ہوں، موسم خوشگوار ہو تو ...... "

مس فریا مضطرب ہو گئی۔ یہ اضطراب چھپانے کی خاطر اس نے کہا "آپ ..... آپ کس قسم کا مشورہ لینے کے لئے آئے ہیں۔

"میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا تھا۔"

"مس فریا پھر اسی رو میں بہہ گئی" ہیں ..... میں اسکو ضرور دیکھوں گی مجھے ..... مجھے خوشی ہو گی۔ کسے معلوم تھا کہ تم اتنی جلدی، شادی کر لو گے۔ تمہاری زندگی میں ..... میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں ضرور ایک بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

سہیل نے جواب دیا "تبدیلی ـــــ کوئی خاص تبدیلی پیدا تو نہیں ہوئی۔ میں پہلے بھی ایسا ہی تھا ـــــ خاص فرق پڑ بھی کیا سکتا ہے ہر حال میں خوش ہوں، بہت ہی خوش ہوں ـــــ شادی بہت اچھی چیز ہے؟

مس فریا نے تھوک نگل کر کہا۔ "کیا شادی واقعی بہت اچھی چیز ہے؟"

"بہت ہی اچھی چیز ہے ـــــ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی شادی کر لو۔"

مس فریا نے میز پر سے رنگین تیلیوں کا بنا ہوا جاپانی پنکھا اٹھایا اور جھلنا شروع کر دیا۔ "مجھے اپنی بیوی کے متعلق کچھ اور بتاؤ ـــــ یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کیسے گذر رہی ہے۔ . . . اسکے خیالات کیا ہیں۔"

فریا کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اسکے ہونٹ کچھ اس انداز سے باتیں کرتے وقت کھل رہے تھے کہ سہیل کو محسوس ہوا فریا کے چہرے پر منہ کے بجائے ایک زخم ہے جس کے ٹانکے اُدھڑ رہے ہیں ـــــ

سہیل نے غور سے اسکی طرف دیکھا اور یوں دیکھتے ہوئے وہ ایک برس پیچھے چلا گیا۔ جب اس نے بڑی نیک نیتی سے اس عورت میں چند خوبصورتیاں تلاش کی تھیں اور ان کا سہارا لے کر اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش کی تھی۔ اب وہی عورت اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی پنکھا جھل کر اپنا اندرونی اضطراب ہلکا کر رہی تھی، ایک برس اس کے کالے چہرے اور خشک بالوں پر سے مزید سیاہی اور خشکی پیدا کئے بغیر گزر گیا تھا۔ مگر سہیل اب بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ یہ

سوچ ہی رہا تھا کہ مس فریا نے اس سے کہا۔ "تم کتنے تبدیل ہو گئے ہو اب تم پورے مرد بن چکے ہو۔"

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا۔ اُس کی مونچھوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر اب اس کے دل میں وہ پہلی سی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

مس فریا نے پنکھا میز پر رکھ دیا اور کہنیاں ٹیک کر سہیل کی طرف اُن بلبلوں کی طرح دیکھنے لگی جو موسم بہار میں لوٹ کر اداس اداس آوازیں نکالا کرتی ہیں۔

جب سہیل نے پنکھے کی ایک اکھڑی ہوئی تیلی نوچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مس فریا نے اُسے آہستہ سے پکڑ کر کہا۔ "یاد ہے تمہیں، ایک دفعہ اسی طرح تم نے میرا ہاتھ دبایا تھا۔"

مس فریا کی آواز لرزاں تھی۔

سہیل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑے خشک لہجہ میں کہا "مس فریا" تمہاری یہ حرکت بہت ہی نازیبا ہے ..... دیکھو، پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بٹوا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا اور بارہ آنے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ "یہ رہا تمہارے آنے جانے کا کرایہ۔"

سہیل جب نیچے اترا تو بازار میں چلتے ہوئے اس نے سوچا "جب بچہ پیدا ہو گا تو میں اسے گود میں اُٹھا کر مس فریا کے پاس ضرور آؤں گا اور فخر کے ساتھ کہوں گا، اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

سہیل بہت خوش تھا۔ جب اُس نے مزا لینے کی خاطر یہ سارا واقعہ دُھرایا تو آخر میں بارہ آنے آئے جو اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکال کر مس فریا کی میز پر رکھے تھے "ارے ـــــــ یہ میں نے اُسے بارہ آنے کیوں دیئے ـــــــ یہ کرایہ کس بات کا تھا؟"

سہیل جب اس کا جواب تلاش نہ کر سکا تو بے اختیار ہنس پڑا۔
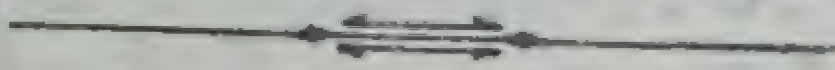
تین انگلیاں

افراد

باٹلی والا .... شوہر	شیریں .... بیوی
جگن ناتھ .... جوہری	کرنل امرناتھ .... مہمان

پولیس انسپکٹر اور دو تین سپاہی

ایکٹ پہلا

پہلا منظر

ایک پر تکلف طریقے پر سجا ہوا ڈرائنگ روم۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹک رہے ہیں۔ قالین بچھا ہوا ہے جو کہ بہت دبیز ہے۔ باٹلی والا ایک صوفے پر اضطراب کے ساتھ اپنی ٹانگ ہلا رہا ہے عقب میں گھر کا نوکر تپائی پر رکھے ہوئے پھولدان کو جھاڑن سے صاف کرنے میں مشغول،

گھنٹی بجتی ہے۔ باٹلی والا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

باٹلی والا۔ وہ آ گئے (سنتو سے) دیکھو سنتو باہر کون ہے ——— میرا خیال ہے کہ لالہ جگن ناتھ ہونگے۔ جاؤ اگر وہی ہوں تو انہیں اندر لے لاؤ۔ کہنا صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

سنتو: بہت اچھا سرکار۔

(سنتو چلا جاتا ہے)

باٹلی والا:۔ میرا خیال ہے جگن ناتھ ہی ہوگا ——— یہ جوہری وقت اور زبان کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔

(سنتو اور جگن ناتھ دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

سنتو:۔ صاحب، لالہ جی تشریف لے آئے ہیں۔

باٹلی والا:۔ آئیے آئیے۔ لالہ جی تشریف لے آئیے ——— خوب وقت پر آئے

جگن ناتھ:۔ آپ نے یاد جو فرمایا تھا۔

باٹلی والا:۔ ادھر کرسی پر تشریف رکھئے ـــ سنتو تم اب جا سکتے ہو ——— آپ تشریف رکھئے۔

(سنتو چلا جاتا ہے)

جگن ناتھ:۔ فرمائیے! کیسے یاد کیا؟

باٹلی والا:۔ میں ابھی سب کچھ عرض کرتا ہوں۔ پہلے آپ فرمائیے کہ آپ کیا پئیں گے۔ آج سردی خوب زوروں پر ہے۔

جگن ناتھ :- جی نہیں تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں۔
باٹلی والا :- لالہ جی میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے موتیوں کے ایک ہار کی قیمت دریافت کرنا ہے۔
جگن ناتھ :- ہار لائیے۔
باٹلی والا :- ہار تو میرے پاس نہیں۔
جگن ناتھ :- تو میں قیمت کیسے بتاؤں؟
باٹلی والا :- (ہنس کر) میں ہار دکھائے بغیر آپ سے قیمت دریافت نہیں کرونگا میں ابھی ہار منگاتا ہوں۔ میری بیوی کے پاس ہے۔
جگن ناتھ :- آپ اُسے بیچنا چاہتے ہیں۔؟
باٹلی والا :- ارادہ تو یہی ہے اگر قیمت اچھی مل جائے ـــــ اچھا تو میں ابھی ہار لے کر حاضر ہوتا ہوں۔
جگن ناتھ :- بہت بہتر۔
باٹلی والا :- اگر کچھ دیر ہو جائے تو معاف فرما دیجئے گا۔
جگن ناتھ :- نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر آپ جلدی واپس آنے کی کوشش کیجیے گا۔ کیونکہ مجھے دکان پر جانا ہے۔
باٹلی والا :- میں ابھی حاضر ہوا۔

(کمرے سے باہر چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرۂ خواب۔ یہ بھی پرتکلف ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ایک خوبصورت پلنگ پر تکیوں کا سہارا لیکر مسز باٹلی والا (شیریں) لیٹی ہے۔ خاوند کے قدموں کی آواز سنتی ہے۔ لیکن حرکت نہیں کرتی۔ وہ اندر داخل ہوتا ہے اور اسکے پاس آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شیریں اسکی طرف بالکل بے توجہی سے دیکھتی ہے۔

باٹلی والا:۔ شیریں

شیریں:۔ (روکھے پن سے) کیا ہے۔

باٹلی والا:۔ تم ابھی تک سو رہی ہو۔

شیریں:۔ تو کیا کروں؟

باٹلی والا:۔ اُٹھو کوئی بات چیت کرو۔

شیریں:۔ آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔

باٹلی والا:۔ کئی دنوں سے تم اس درد کی شکایت کر رہی ہو ―― کسی ڈاکٹر کو بلواؤں۔؟

شیریں:۔ نہیں ―― تمہاری بہت مہربانی ہے۔

باٹلی والا:۔ تم مجھ سے ابھی تک ناراض ہو؟

شیریں:۔ کاش کہ میں ہو سکتی۔

باٹلی والا:۔ تم بات بات پر ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کر دیتی ہو۔

شیریں :- قسمت میں ہے جو یہی۔
باٹلی والا :- قسمت کا گلہ ابھی تک تمہاری زبان پر ہے۔
شیریں :- زندہ جو ہوں۔
باٹلی والا :- تمہارے یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔
شیریں :- میری رگ رگ میں تم خود زہر بھر چکے ہو۔
باٹلی والا :- تمہیں میری قسموں کا اعتبار نہیں آیا؟
شیریں :- آجاتا اگر تمہاری آنکھوں میں ہر وقت مجھے ایک سیال خطرہ تیرتا نظر نہ آئے
باٹلی والا :- خطرہ ـــــ کس بات کا خطرہ؟
شیریں :- جانے دو ان باتوں کو ـــــ کہو کیسے آئے۔؟
باٹلی والا :- ایک دوست ابھی ابھی ملنے کے لئے آئے ہیں۔ باتوں باتوں تمہارے ہار کا تذکرہ ہوا۔ میں نے بہت تعریف کی۔ چنانچہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ یہاں کے بہت بڑے جوہری ہیں۔
شیریں :- میرے صندوقچے میں پڑا ہے لیجاؤ ـــــ پر......
باٹلی والا :- پر کیا؟
شیریں :- کچھ نہیں۔
باٹلی والا :- کچھ تو ہے۔
شیریں :- کہہ جو دیا۔ کچھ نہیں۔
باٹلی والا :- تمہاری مرضی لیکن تمہارے من میں کوئی بات ضرور ہے۔
شیریں پلنگ پر سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اپنی

انگلیوں کے ناخن رگڑنا شروع کر دیتی ہے)

شیریں :- تمہارا خیال صحیح ہے ـــــ دراصل میں بہت تھکی ہوئی ہوں
جاؤ اپنے جوہری دوست کو ہار دکھا آؤ - پھر بات کریں گے۔
(باٹلی والا اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر سے ایک صندوقچہ اٹھاتا ہے)

باٹلی والا :- اس صندوقچے میں ہے؟

شیریں :- اسی میں ہے۔

باٹلی والا :- تم اتنی قیمتی چیزوں کو یوں کھلے صندوقچے میں کیوں رکھا کرتی ہے؟
کچھ احتیاط تو ہونی چاہئے۔

شیریں :- مجھے زیوروں سے اب کوئی دلچسپی نہیں۔

باٹلی والا :- تعجب ہے۔

شیریں :- واقعی تعجب ہے۔

باٹلی والا :- تعجب ہے کہ اتنے سستے داموں پر یہ ہار مجھے کیسے مل گیا تھا۔؟
ایسے خوبصورت اور گول موتی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے ـــــ یہ بھی
تعجب ہے کہ اس بارے میں تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہی ـــــ شیریں تمہیں
ٹھیک ٹھیک یاد ہوگی۔ کتنے میں یہ ہار ہم نے خریدا تھا؟

شیریں :- تم نے شادی سے پہلے لیا تھا ـــــ جب تم مجھ سے محبت کیا کرتے تھے،

باٹلی والا :- مجھے یاد آ گیا میں نے اسے سنگاپور میں چالیس ہزار روپے میں لیا تھا
ـــــ بہت سستا سودا تھا۔ اس غریب کو روپے کی اشد ضرورت تھی،
ـــــ بہت سستا سودا تھا، کیوں شیریں؟

شیریں :- سودا بیشک سستا تھا۔ مگر سستے سودے سستے ہی ہوتے ہیں۔
اگر مجھے حاصل کرنے کیلئے تمہیں بڑی قربانی کرنی پڑتی تو آج حالات بالکل
مختلف ہوتے ـــــ اصل میں عورت ہمیشہ بہت سستے داموں پر اپنا آپ حوالے
کر دیتی ہے۔

باٹلی والا :- اس موقع کو پانچ برس ہو گئے ـــــ پانچ برس ـــــ کتنے
انقلاب آچکے ہیں۔ مگر یہ ہار ویسے کا ویسا چمکیلا ہے ـــــ تمہارے
دانت بھی کبھی اسی طرح چمکا کرتے تھے۔

شیریں :- کبھی

باٹلی والا :- (وقفہ) عورتوں اور موتیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

شیریں :- اس لئے کہ موتیوں کا ہار پرویا جا سکتا ہے عورتوں کا نہیں۔

باٹلی والا :- (ہنستا ہے) . . . . خوب کہا ـــــ اچھا میں ابھی آتا ہوں
ـــــ یہ ہار اُسے دکھا دوں۔

شیریں :- جاؤ

(باٹلی والا ہار لیکر باہر چلا جاتا ہے۔ شیریں جمائی لیکر اٹھتی ہے اور پھر پلنگ پر لیٹ جاتی ہے)

تیسرا منظر

وہی ڈرائنگ روم جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں لالہ جگن ناتھ جوہری اٹھ کر
ایک تصویر دیکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے گویا اس طرح وقت کاٹنا چاہتا ہے کہ

(اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور باٹلی والا ہار لے کر اندر داخل ہوتا ہے)

باٹلی والا :۔ معاف فرمایئے گا لالہ جگن ناتھ صاحب ـــــ مجھے بہت دیر ہو گئی
جگن ناتھ :۔ جی ہاں ۔ کافی دیر ہو گئی ۔ مگر خیر ـــــ آپ ہار تو لے آئے ؟
باٹلی والا :۔ جی ہاں ۔ لے آیا ۔ دیکھئے ۔
(جگن ناتھ کی ہتھیلی پر ہار رکھ دیتا ہے ـــــ جگن ناتھ اسے غور سے دیکھتا ہے)
باٹلی والا :۔ مجھے دیر اس لئے ہو گئی کہ میری بیوی نے اسے خدا معلوم کہاں رکھ چھوڑا تھا بڑی تلاش کے بعد ملا ـــــ اسے زیوروں سے بالکل دلچسپی نہیں
جگن ناتھ :۔ اس ہار سے بھی نہیں ؟ ـــــ مسٹر باٹلی والا ۔ یہ تو بہت ہی قیمتی چیز ہے ۔
باٹلی والا :۔ جی مجھے معلوم ہے ۔
جگن ناتھ :۔ بہت ہی عمدہ موتی ہیں ۔
باٹلی والا :۔ اچھے ہی تھے تو میں نے یہ ہار ایک بہت بڑی قیمت پر خریدا ۔
جگن ناتھ :۔ کیا شک ہے ـــــ آپ نے کم از کم ـــــ کم از کم ـــــ ساٹھ ہزار سے آپ نے کیا کم دیئے ہوں گے ؟
باٹلی والا :۔ کم تو نہیں اس سے زیادہ دیئے تھے ۔
جگن ناتھ :۔ تو آپ اسے بیچنا چاہتے ہیں ۔ ؟
باٹلی والا :۔ مجھے روپے کی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر اچھی قیمت مل جائے تو میں اسے بیچ دوں گا ـــــ میری بیوی کو ویسے ہی

کھو جائے گا ـــ دراصل وہ اس ہار کو منحوس بھی سمجھتی ہے۔

جگن ناتھ :- کوئی خاص بات ہے۔

باٹلی والا :- کوئی بھی نہیں ـــ عورتوں کے دماغ میں وہم پیدا ہوتے دیر ہی کیا لگتی ہے

جگن ناتھ :- درست فرمایا آپ نے ـــ تو آپ اسے بیچ ڈالنا چاہتے ہیں

(دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

باٹلی والا :- اگر کوئی اچھا گاہک مل جائے۔

جگن ناتھ :- اچھا گاہک تو ملنا مشکل ہے ـــ لیکن ٹھہریئے ـــ ایک گاہک میری نظر میں ہے۔ ـــ مسٹر امرناتھ کو آپ جانتے ہیں؟

باٹلی والا :- جی نہیں کون صاحب ہیں؟

جگن ناتھ :- میں بھولا کرنل امرناتھ

باٹلی والا :- جی نہیں، میں کرنل امرناتھ کو نہیں جانتا

جگن ناتھ :- ابھی حال ہی میں ریٹائر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے صورت میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا :- سورت میں ـــ میں صورت کا رہنے والا ہوں۔ وہاں کی میری بیوی ہے ـــ ہاں تو یہ کرنل امرناتھ......

جگن ناتھ :- میرے بہت پرانے گاہک ہیں۔ شاید وہ یہ ہار لینا پسند کریں

باٹلی والا :- آدمی کیسا ہے۔؟

جگن ناتھ :- بیحد شریف آدمی ہیں ـــ ابھی تو جوان ہیں۔ نہ معلوم کیسے ریٹائر ہو کر یہاں چلے آئے؟

باٹلی والا :- تو یہ کرنل صاحب ہار لے لیں گے؟

جگن ناتھ :۔ میرا خیال ہے۔

باٹلی والا :۔ تو آپ ان سے بات چیت کیجئے ـــــ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔

جگن ناتھ :۔ بہت بہتر

باٹلی والا :۔ جب آپ نے کہا ہے کہ آدمی شریف ہے تو ایسا کیوں نہ کریں کہ اُسے یہیں بُلوا لیں آج ہی رات دعوت کر دیتے ہیں میرا مطلب ہے اگر ایسا ہو سکے ـــــ اگر وہ یہاں آنا چاہے ـــــ تھوڑی دیر باتیں بھی رہینگی، کیا خیال ہے آپ کا؟

جگن ناتھ :۔ عجیب بات ہے وہ کل ہی آپ کا ذکر رہے تھے۔

باٹلی والا :۔ کس سلسلے میں؟

جگن ناتھ :۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن ایسے ہی باتوں باتوں میں آپ کا ذکر آگیا تھا میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ انہیں جانتے ہونگے۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے آپ کا ذکر کیا تھا اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور آپ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

باٹلی والا :۔ خیر پہلے نہیں جانتے تھے تو اب جان لیں گے۔ آپ انہیں میری طرف سے دعوت دیدیجئے گا۔ کہئے گا کہ مسٹر اور مسز باٹلی والا آپ سے مل کر خوش ہونگے ـــــ اگر موقع ملا تو بار کی بات ڈیس ٹربر ہو جائے گی آپ کی کمیشن تو ہر وقت کھری ہے۔

جگن ناتھ :۔ تو میں اب جاتا ہوں ـــــ یہ لیجئے ہار

دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ باٹلی والا ہار لے لیتا ہے)

باٹلی والا :- آپ بھی تشریف لائیے گا ـــــ یعنی اگر کرنل مرنا تھ ہماری دعوت قبول کریں تو آپ بھی تشریف لائیے گا۔

جگن ناتھ :- بہت بہتر میں حاضر ہو جاؤں گا۔

باٹلی والا :- جی نہیں آپ کا آنا بہت ضروری ہے ـــــ آپ کو آنا ہی پڑے گا

جگن ناتھ :- اگر انہوں نے دعوت قبول کر لی تو میں آپکو فون کر دوں گا

باٹلی والا :- جی ہاں یہ ٹھیک رہے گا

جگن ناتھ :- اچھا تو آداب عرض ہے

باٹلی والا :- آداب عرض ہے۔

(جگن ناتھ جوہری چلا جاتا ہے۔ دوسرے دروازے سے خود باٹلی والا ہار کو ہاتھوں میں اچھالتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

چوتھا منظر

(شیریں کا کمرۂ خواب۔ شیریں نیا لباس پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہے اور بڑی بدلی سے اپنے بال سنوار رہی ہے اس کا شوہر ہاتھوں میں اسی طرح ہار اچھالتا اندر آتا ہے اور شیریں کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے شیریں اس کا عکس آئینے میں دیکھتی ہے)

شیریں :- ہار دیکھ لیا تمہارے دوست نے۔

باٹلی والا :- ہاں دیکھ لیا اور میری امید کے مطابق بہت پسند کیا اگر ہم اسے بیچنا چاہیں تو ساٹھ ستر ہزار بڑی آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

شیریں : بیچ دو۔

باٹلی والا : بیچ کے کیا کروں گا ـــــ تم بیچ ڈالو

شیریں :۔ پڑا رہے۔

باٹلی والا :۔ اچھا تو سنبھالو ـــــ

شیریں :۔ رکھ دو اس میز پر۔

باٹلی والا (سنگھار میز پر ہار رکھ دیتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

تم آج کل اتنی اُداس کیوں رہتی ہو؟

شیریں :۔ (مڑکر) اب پھر وہی باتیں نہ شروع کرو ـــــ میں اداس

ضرور ہوں پر یہ باتیں اور بھی زیادہ اداس ہیں۔

باٹلی والا :۔ تمہاری تفریح کے لئے آج میں نے دو دوستوں کو ڈنر پر بلایا ہے

شیریں :۔ (سنگھار میز کے پاس سے ہٹ کر پلنگ کی طرف جاتے ہوئے) یہ دو

دوست کون ہیں۔

باٹلی والا :۔ ایک تو یہی ہونگے جو ابھی آئے تھے دوسرے انکے دوست

ہیں۔ ان کو میں نہیں جانتا ـــ تمہارا ہار دیکھیں گے۔ جگن ناتھ

کہتا تھا کہ وہ موتیوں کے عاشق ہیں ـــــ موتیوں کو کون

پسند نہیں کرتا ایک صرف تم ہو جو . . . . . .

شیریں :۔ کیا میرا دعوت میں شامل ہونا ضروری ہے؟

باٹلی والا :۔ ضروری تو نہیں۔ تمہارا جی بہل جائے گا ذرا اِدھر اُدھر کی باتیں

کرینگے جگن ناتھ موتیوں کے قصے سنائے گا اور اس کا دوست جو کہ ڈاکٹر

اور ابھی ابھی جنگ کے میدان سے آیا ہے مریضوں کی داستانیں سنائیگا
تم اس سے اپنے درد سر کی دوا ابھی پوچھ لینا۔

شیریں :- تمہیں میری اتنی فکر نہیں کرنی چاہئیے۔

باٹلی والا :- (ہنستا ہے) بہت بہتر ——— میں یہاں سے چلا جاتا ہوں؟

شیریں :- نہیں بیٹھو۔ لیکن ایسی باتیں شروع نہ کرو جس سے ..... خیر
یہ ڈاکٹر کون ہیں؟

(پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

باٹلی والا :- میں نہیں جانتا ——— اگر انہوں نے دعوت قبول کر لی تو آج شام کو پتہ
لگ جائے گا .... (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

باٹلی والا :- دیکھنا کون ہے ——— میرا خیال ہے جگن ناتھ ہو گا۔

شیریں :- وہی جو ابھی آئے تھے۔

باٹلی والا :- ہاں وہی ——— دیکھو تو۔

شیریں :- (اٹھ کر تپائی پر سے ٹیلیفون کا چونگا اٹھاتی ہے) ..... ہلو ——— مسز باٹلی والا
سپیکنگ ——— گڈ ایوننگ ——— جی ہاں ——— میرے پاس ہی
بیٹھے ہیں ——— بہت بہتر ——— شکریہ ———

(ٹیلیفون کا چونگا رکھ دیتی ہے)

باٹلی والا :- جگن ناتھ ہی تھا۔

شیریں :- وہی تھا ——— آپ کی دعوت قبول کر لی گئی ہے ——— نو بجے
یہ لوگ پہنچ جائیں گے۔

ایکٹ دوسرا

رات کا وقت ہے وہی ڈرائنگ روم جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں پردہ اٹھتا ہے گھڑیال نو بجا چکا ہے۔ باٹلی والا کرنل امرناتھ اور جگن ناتھ تینوں کھڑے نظر آتے ہیں۔

باٹلی والا :- آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کرنل امرناتھ

امرناتھ :- آپ سے زیادہ مجھے ہوئی۔

باٹلی والا :- ہاتھ نہیں ملائیں گے آپ۔

امرناتھ :- (ہنس کر) اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے ـــــ اس کے علاوہ ہاتھ ملانا کچھ مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ برا نہ مانیئے گا طبی نقطہ نگاہ سے ہاتھ ملانا ٹھیک نہیں۔

باٹلی والا :- (ہنستا ہے) نہ جانے کیا کیا نقطے اور پیدا کئے جائیں گے ـــــ بہر حال آپ کی ہر بات ماننا پڑے گی۔

امرناتھ :- (ہنستا ہے) ڈاکٹروں کی ہر بات مان لی جائے تو آدھی بیماریاں کم ہو جائیں

باٹلی والا :- جگن ناتھ صاحب آپ خاموش کیوں ہیں ـــــ بتایئے کیا آپ کرنل صاحب کی ہر بات مان لیا کرتے ہیں؟

جگن ناتھ :- میں نے تو آج تک ان کی کوئی بات نہیں مانی۔

باٹلی والا :- یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہمیشہ زکام کی شکایت رہتی ہے۔

(امرناتھ۔ جگن ناتھ اور باٹلی والا تینوں ہنستے ہیں اور صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

باٹلی والا :- (توقف کے بعد) کرنل امرناتھ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ غریب خانے پر

بغیر کسی تعارف کے تشریف لے آئے۔

امرناتھ :۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ ممنون مجھے ہونا چاہئے۔

باٹلی والا :۔ کرنل امرناتھ ۔ میں آپ سے ایک بات پوچھوں ۔ آپ اپنا یہ ہاتھ جیب میں کیوں رکھتے ہیں ۔ کیا اس میں بھی کوئی خاص نکتہ ہے۔

امرناتھ :۔ (ہنس کر) جی نہیں ـــــ عادت سی ہو گئی ہے۔

باٹلی والا :۔ آدمی عجیب عادات اختیار کر لیتا ہے (شیریں اندر داخل ہوتی ہے سیاہ لباس میں) لیجئے شیریں بھی آ گئی ـــــ شیریں آؤ ـــــ کرنل امرناتھ سے ملو۔

شیریں :۔ (چونک کر) کرنل امرناتھ . . . . . .

(امرناتھ اٹھ کر شیریں کی طرف دیکھتا ہے اور گھبرا جاتا ہے)

امرناتھ :۔ میں ـــــ میں !

باٹلی والا :۔ کرنل امرناتھ یہ میری بیوی ہے۔

امرناتھ :۔ ب ـــــ ب ۔ بہت خوشی حاصل ہوئی۔

باٹلی والا :۔ شیریں یہ کرنل امرناتھ ہیں ۔

شیریں :۔ آپ تشریف رکھئے ـــــ میں یہاں بیٹھ جاؤنگی۔

(کرنل امرناتھ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے شیریں ایک کرسی آگے کر کے اس پر بیٹھ جاتی ہے)

جگن ناتھ :۔ معلوم ہوتا ہے مسز باٹلی والا سے آپ کی پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔

شیریں :۔ جی ہاں یہ سورت میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا :۔ تو ـــــ تو ـــــ آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہوگا ؟ ممکن ہے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی شیریں نے آپ سے طبی مشورہ بھی لیا ہو۔

امرناتھ :- جی ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔

باٹلی والا :- (اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہے) میں ابھی حاضر ہوا ــــ ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے

(باہر چلا جاتا ہے)

جگن ناتھ :- کرنل امرناتھ۔ آپ نے مسز باٹلی والا کا ہار دیکھا؟

امرناتھ :- جی ہاں دیکھا ہے۔ سب سے پہلے میری نظر اسی پر پڑی تھی۔

شیریں :- آپ دیکھیں گے؟

امرناتھ :- اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔

شیریں :- مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ شوق سے دیکھئے ــــ یہ ــــ یہ لیجئے ــــ (گلے سے ہار اتار کر امرناتھ کو دیتی ہے)

امرناتھ :- شکریہ ...... بہت اچھا ہار ہے ــــ ہر ایک موتی اپنی جگہ ــــ ہیلو یہ کیا ہوا؟ ــــ (ایک دم لائٹ اوف ہو جاتی ہے۔ بالکل اندھیرا چھا جاتا ہے)

جگن ناتھ :- لائٹ اوف ہو گئی۔

شیریں :- (گھبرا کر) ...... یہ کیا ہوا؟

امرناتھ :- کچھ نہیں ...... ابھی روشنی ہو جائے گی۔

شیریں :- امرناتھ۔

جگن ناتھ :- مسز باٹلی والا ــــ مسٹر باٹلی والا کہاں گئے؟

ایک دم شیریں کے چیخنے کی آواز ــــ دو آدمیوں کی باہمی کشمکش ــــ شیریں اور زیادہ زور سے چیختی ہے مگر یہ چیخ اُسکے حلق ہی میں دبا دی جاتی ہے ــــ گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شیریں سانس لینے کی کوشش کرتی ہے مگر اسے سانس نہیں آتا ــــ اس دوران میں جگن ناتھ

باگلوں کی طرح چیختا رہتا ہے "مسٹر باٹلی والا ـــــ مسٹر باٹلی والا ـــــ یہ کیا ہوا ہے؟ کوئی ہے ـــــ کوئی ہے ـــــ شیریں کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اسکی آواز اسکے گلے ہی میں دبا دی جاتی ہے۔ پھر ایکدم روشنی ہوتی ہے۔ قالین پر شیریں کی لاش پڑی دکھائی دیتی ہے

جگن ناتھ:۔ روشنی ہو گئی ـــــ مہ ـــــ مہ ـــــ مگر یہ کیا ہے ـــــ مسز باٹلی والا

مسز باٹلی والا بیہوش پڑی ہیں۔ کرنل امرناتھ ـــــ کرنل امرناتھ

(ایک لحظہ کے لئے مکمل سکوت)

جگن ناتھ:۔ (زور سے) کرنل امرناتھ

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ پھر سامنے کے دروازے سے باٹلی والا اندر داخل ہوتا ہے)

جگن ناتھ:۔ کون؟

باٹلی والا:۔ میں ہوں ـــــ کیوں ـــــ ارے یہ کیا ہوا (دوڑ کر شیریں کی لاش کے پاس جاتا ہے) ـــــ شیریں ـــــ شیریں ـــــ شیریں۔ جگن ناتھ صاحب یہ کیا معاملہ ہے؟

جگن ناتھ:۔ (لرزاں آواز میں) مجھے ـــــ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

باٹلی والا:۔ شیریں ـــــ شیریں ـــــ (آواز بھرا جاتی ہے) شیریں ـــــ اس کا گلا کس نے گھونٹا ہے؟ ـــــ جگن ناتھ صاحب آپ دیکھ رہے ہیں یہ نشان گردن پر ـــــ دس انگلیوں کے نشان صاف طور پر نظر آرہے ہیں ـــــ کرنل امرناتھ کہاں ہیں؟ (قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باٹلی والا اٹھ کھڑا ہوتا ہے ـــــ سامنے کے دروازے سے کرنل امرناتھ اندر آتا ہے)

امرناتھ:۔ فرمائیے۔

جگن ناتھ :- آپ کہاں چلے گئے تھے ـــــ آپ نے ـــــ آپ نے دیکھا ـــــ یہ کیا ہو گیا ہے؟

امرناتھ : (سنجیدگی کے ساتھ) میں ٹیلیفون کرنے گیا تھا۔

باٹلی والا :- ٹیلیفون؟

امرناتھ :- جی ہاں - پولیس اسٹیشن ٹیلیفون کرنا تھا

(سنتو پاگلوں کی طرح دوڑتا اندر آتا ہے)

سنتو :- سرکار ـــــ سرکار ـــــ

باٹلی والا :- کیا ہے؟

سنتو :- تھانے سے کچھ آدمی آئے ہیں۔

باٹلی والا :- انہیں اندر بھیج دو۔

(سنتو باہر چلا جاتا ہے)

باٹلی والا :- ہار؟ ـــــ ہار کہاں ہے؟ ـــــ شیریں نے ہار پہنا ہوا تھا۔

جگن ناتھ :- کرنل صاحب آپ نے لیا تھا۔

امرناتھ :- میں نے ـــــ ہار لیا تھا - پر جب بجلی گُل ہوئی تھی تو یہیں گر پڑا تھا ـــــ ٹھہریئے میں ڈھونڈتا ہوں۔

باٹلی والا :- کرنل امرناتھ - آپ کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی ہے - شیریں کو قتل کیا گیا ہے اور ہار غائب ہے۔

امرناتھ :- آپ کا مطلب

باٹلی والا :- میرا مطلب بہت واضح ہے ـــــ پولیس اسٹیشن کو ٹیلیفون بھی آپ ہی نے

کیا ہے ——— (انسپکٹر پولیس اور چند سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں)

پولیس انسپکٹر:- یہاں سے ٹیلیفون کس نے کیا تھا؟

امرناتھ:- میں نے۔

انسپکٹر:- کیا ہوا ہے؟

باٹلی والا:- دیکھ لیجئے ——— میری بیوی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اور ہار غائب ہے

انسپکٹر:- یہاں سے کوئی آدمی باہر تو نہیں گیا؟

باٹلی والا:- جی نہیں ——— کرنل امرناتھ میری بیوی کا ہار دیکھنے آئے تھے لالہ جگن ناتھ جوہری کے ساتھ (جگن ناتھ کی طرف اشارہ کرکے)

انسپکٹر:- پھر کیا ہوا؟

جگن ناتھ:- مسٹر باٹلی والا کہیں ٹیلیفون کرنے باہر گئے ——— تھوڑی دیر کے بعد ایک دم بجلی آف ہو گئی اور کسی نے مسز باٹلی والا کا گلا گھونٹ دیا۔ ——— اس قدر اندھیرا تھا کہ سجھائی نہیں دیتا تھا صرف آوازیں آتی تھیں

انسپکٹر:- کرنل امرناتھ کہاں تھے؟

امرناتھ:- بجلی گل ہوتے ہی میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا

انسپکٹر:- کیوں؟

امرناتھ:- آپ کو ٹیلیفون کرنے کے لئے۔

انسپکٹر:- آپ نے مسز باٹلی والا کا ہار دیکھا؟

امرناتھ:- جی ہاں۔ انہوں نے اپنے گلے سے اتار کر دیا۔ مگر جب بجلی آف ہوئی اور میں دوڑ کر باہر نکلا تو وہ یہیں گر گیا۔ تلاش کرنے پر مل جائے گا۔

باٹلی والا :- اگر وہ یہاں گرا ہوتا تو نظر آجاتا۔

امرناتھ :- انسپکٹر صاحب ـــــ میری طبیعت خراب ہے۔ نوازش ہوگی
اگر آپ مجھے یہاں سے گھر جانے کی اجازت دے دیں۔

انسپکٹر :- کرنل امرناتھ آپ زیر حراست ہیں۔

امرناتھ :- زیر حراست؟

انسپکٹر :- جی ہاں ــــ آپ دوسرے کمرے میں گئے تھے ــــ دیکھو
جمال دین تم دوسرے کمرے میں جا کر ہار کی تلاش کرو۔

جمال دین :- بہت بہتر جناب

(باہر چلا جاتا ہے)

امرناتھ :- تو آپ کو مجھ پر شک ہے؟

انسپکٹر :- مجھے ہر ایک پر شک ہے؟

جگن ناتھ :- (گھبرا کر) مگر ـــ مگر میں تو بالکل نردوش ہوں۔

انسپکٹر :- تو آپکی بیوی کا گلا گھونٹا گیا ہے (لاش کے پاس جا کر غور سے گردن کے
نشانات دیکھتا ہے) ...... ہاں گلا ہی گھونٹا گیا ہے اور بہت ظالمانہ
طور پر گھونٹا گیا ہے۔ دس انگلیوں کے نشان گردن پر صاف نظر آرہے ہیں
ـــــ کرنل امرناتھ کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔

باٹلی والا :- جی نہیں۔ آج ہی میرے گھر آئے ہیں۔ ہار دیکھنے کے لئے۔

انسپکٹر :- آپ کی بیوی کو جانتے تھے؟

امرناتھ :- ایک دو بار سرسری ملاقات سورت میں ہوئی تھی۔

انسپکٹر :- ٹھیک !

(جمال دین سیاہی ہار اور ایک اور کوٹ لئے اندر خوش خوش داخل ہوتا ہے)

جمال دین :- انسپکٹر صاحب ہار مل گیا۔

امرناتھ :- لیجئے صاحب ہار مل گیا ہے۔

انسپکٹر :- کہاں سے ملا۔

جمال دین :- اس اوور کوٹ کی اندرونی جیب سے

انسپکٹر :- یہ کوٹ کس کا ہے۔

امرناتھ :- میرا ہے ـــــ مگر یہ ہار میں نے اس میں نہیں رکھا۔

انسپکٹر :- کرنل صاحب اب معاملہ بالکل صاف ہے ـــــ میں آپ کو مسز باٹلی والا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔

امرناتھ :- میں نے شیریں کو قتل نہیں کیا ـــــ آپ ـــــ آپ غلط کہتے ہیں

انسپکٹر :- میں غلط کہتا ہوں لیکن مرحومہ کی گردن غلط نہیں کہتی۔ اس پر آپ کے دونوں ہاتھ نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئے ہیں۔

امرناتھ :- تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شیریں کا گلا گھونٹا ہے۔؟

انسپکٹر :- جی ہاں۔

امرناتھ :- اور یہ دس انگلیوں کے نشان جو بیچاری شیریں کی گردن پہ نظر آ رہے ہیں میرے ہیں؟

انسپکٹر :- جی ہاں۔

امرناتھ :- تو آپ کو بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔

انسپکٹر :- کیسے؟

امرناتھ :- ادھر دیکھئے...... (کوٹ میں سے ہاتھ نکالتا ہے)... آپ میرا یہ ہاتھ دیکھ رہے ہیں ـــــ یہ داہنا ہاتھ ـــــ ایک - دو - تین اس میں تین انگلیاں نہیں ہیں ـــــ ایک پرشین میں تین انگلیاں کٹوا کر مجھے جنگ کے میدان سے یہاں آنا پڑا ہے سنا بھاگا ہے

انسپکٹر :- تین انگلیاں ـــــ ہاں سچ مچ تین انگلیاں غائب ہیں تو پھر مسٹر باٹلی والا کو قتل کس نے کیا ہے؟

امرناتھ :- آپ مسٹر باٹلی والا کو اپنی بیوی شیریں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیجئے ـــــ عدالت میں سارا واقعہ میں بیان کر دونگا ـــــ سورت میں بھی انہوں نے ایک دفعہ اس غریب کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے بچا لیا تھا ـــــ افسوس ہے کہ اس مرتبہ باوجود کوشش کے اس کو نہ بچا سکا۔

(شیریں کی لاش کی طرف دیکھتا ہے اور فرطِ غم سے منہ موڑ لیتا ہے)

باٹلی والا :- یہ جھوٹ ہے ـــــ (کانپتی آواز میں) ـــــ یہ جھوٹ ہے ـــــ

انسپکٹر :- بھاگنے کی کوشش نہ کیجئے ـــــ سپاہی مکان کے باہر بھی کھڑے ہیں

انسپکٹر باٹلی والا کو پکڑ کر ہتھکڑی پہنا دیتا ہے

پردہ

آم

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے چنانچہ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ہر مہینے پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لئے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں خزانچی کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر "اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لئے حاضر ہوں گا" بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالبات خفیفہ کی کچہری میں کبھی محافظ دفتر ہوا کرتا تھا بیحد وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک

تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسران بالا نے ہمیشہ اسکی تعریف کی ہے۔ بعض منصفوں کو تو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی اس کے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے مگر وہ جوانی میں بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسا ہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربی اور مہربان جج کا لڑکا تھا جج صاحب کی وفات پر اُسے بہت صدمہ ہوا تھا اب وہ ہر مہینے ان کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا اس سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش اُنہیں چھوٹے جج صاحب، کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور حق لیکے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب اسکو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے، فوراً اندر بلا لیتے اور سب کام چھوڑ کر اس سے باتیں شروع کر دیتے۔

"تشریف رکھئے منشی صاحب ——— فرمائیے مزاج کیسا ہے؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ——— آپکی دعا سے بڑے مزے میں گزر رہی ہے، میرے لائق کوئی خدمت؟"

"آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ خدمت گزاری تو بندے کا کام ہے۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے۔"

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم بخش جج صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اُن کے بلند کردار کی وضاحت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا۔ "اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔"

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا۔ محسوس کر کے کہتا تھا۔ اسکے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جو خزانے کے بڑے افسر تھے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پر آموں کا ایک ٹوکرا پہونچ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرا دیتے تھے "منشی صاحب، دیکھئے اس موسم پر آموں کا ٹوکرا بھیجنا نہ بھولئے گا پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اس میں تو صرف دو میرے حصّے میں آئے تھے۔"

کبھی یہ تین ہو جاتے تھے، کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا منشی کریم بخش یہ سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے ——جونہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔—— دو کیسے دو حاضر کر دوں۔ یہ باغ کس کے ہیں؟ —— آپ ہی کے تو ہیں۔"

کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے۔ "منشی جی آپ کے باغ کہاں ہیں؟"

دُنیا نگر میں حضور ـــــ زیادہ نہیں ہیں صرف دو ہیں اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے۔

مئی کی پنشن لینے کے لئے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے چھوٹے جج صاحب کے کمرہ کا رخ کیا۔ حسب معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا۔ جس پر منشی کریم بخش نے کہا۔ "دنیا نگر سے چھٹی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا۔ جونہی چیپ آگیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی میں فوراً پہلا ٹوکرا لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا ـــــ چھوٹے جج صاحب! اس دفعہ ایسے تحفہ آم ہونگے کہ آپکی طبیعت خوش ہو جائیگی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھدیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کیلئے ایک ٹوکرا خاص طور پر بھروا دیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہونچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آگیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال جس کا

خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس مختصر سے کنبے کے باوجود پچاس روپیوں میں اس کا گذر بہت ہی مشکل سے ہوتا تھا اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیوران آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ بک گئے تھے۔ منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا اسکی بیوی اور وہ بڑے کفایت شعار تھے مگر اس کفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہ بچتا تھا۔ اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بیحد مسرت محسوس کرتا تھا ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گزاری میں جن سے اسے دلی عقیدت تھی۔

ان خاص آدمیوں میں سے ایک تو جج صاحب کے لڑکے تھے دوسرے ایک ور افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گزار رہے تھے ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔

باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے ہر روز پچھلے دن کی خبریں سنتا تھا کبھی کبھی جب وہ بیتے ہوئے دنوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصّے سنانا شروع کر دیتے تھے۔ کہ کس طرح انہوں نے لائل پور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح ان کے رعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا۔ منشی صاحب

کہئے! اب کی دفعہ فصل کیسی رہے گی"۔ پھر چلتے چلتے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب یہ بھی کہتے" پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اچھے تھے۔ بے حد لذیذ تھے"
انشاء اللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کرونگا
ایک ہی بوٹے کے ہونگے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہونگے"۔
اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرہ بھیجتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرہ نوکروں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا "ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں ـــــ اپنے باغ ہیں۔ اگر ایک ٹوکرہ یہاں لے آیا تو کیا ہو گیا۔ بازار سے آپ ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں ـــــ یہ آم چونکہ اپنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گھلاوٹ، خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں اس لئے یہ چند تحفے کے طور پر لے آیا"۔
آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اُسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک سکو سرور رکھتی تھی
منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ مگر یہ ڈھیلا پن بدصورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہاتھوں کی پھولی ہوئی رگیں سر کا خفیف سا ارتعاش اور چہرے کی گہری لکیریں اسکی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے کپڑے بھی وہ صاف ستھرے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار اُبھر آتا تھا۔
اس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ جو دانت

نکل جانے کے باعث اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے، ہلکے سُرخ تھے، خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔

وہ کمزور ضرور تھا، پینسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس بچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کرینگے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ ان کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا تھا۔ داغی یا گلے سڑے دانے الگ کئے جاتے تھے۔ اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہن اور اسکی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی "کیا حرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لئے جائیں" تو منشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا "اور آ جائیں گے اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔

جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو گلی کے سارے آدمیوں کو اسکی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ نیچہ بند کا لڑکا جو کبوتر پالنے کا شوقین تھا

دوسرے روز ہی آدھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا۔ "خالہ میں گھاس لینے کے لئے آیا ہوں۔ کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے ان میں سے جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دے دیجئے۔"

ہمسائی نوراں جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں، اسی روز شام کو ملنے آجاتی تھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی تھی۔ "پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ اب کے بھی ایک ٹوکرہ دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے۔ گلے سڑے دانے الگ کئے گئے جو اچھے تھے ان کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوایا۔ بارہ بجے سے پہلے یہ کام ختم ہوگیا۔ چنانچہ دونوں ٹوکرے غسلخانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دیئے گئے تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔

ادھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں میں عام طور پر غسلخانے کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آجاتی تھی لیکن اب کے اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے۔ اس کو گرم کمرے ہی میں جو بالکل تنور بنا ہوا تھا چھ بجے تک وقت گزارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے اسے ایک دن آگ کے بستر پر گزارنا پڑتا تھا مگر وہ اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کر کے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر ایک پل کے لئے بھی اسے آرام نصیب نہ ہوتا۔ جون کی گرمی اور رضوی قسم کی پنکھیاں کیسے سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسلخانے میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اکھڑ رہا ہے اور وہ سانس کا سارا گہرائیوں میں اتر رہا ہے اس قسم کے دورے اسے کئی بار پڑ چکے تھے اس لئے کہ اس کا دل کمزور تھا مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔

یہ آواز سن کر اس کی بیوی اور بہن دونوں دوڑی دوڑی اندر آئیں دونوں جانتی تھیں کہ اسے اس قسم کے دورے کیوں پڑتے ہیں۔ فوراً ہی اس کی بہن نے عبداللہ نیچہ بند کے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے تاکہ وہ طاقت کی سوئی لگا دے لیکن چند منٹوں ہی میں منشی کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بیقراری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا۔ جس کے باعث آس پاس کے کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کوشش کی گئی اس کی حالت ٹھیک ہو جائے لیکن کامیابی نصیب

نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے منشی کریم بخش زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر اس نے عبداللہ نیچہ بند کو جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سب لوگ باہر چلے گئے اس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر داخل ہوئیں رو رو کر ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس بلایا اور کہا۔ "دو نوں ٹوکرے آج شام ہی ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہونچ جانے چاہئیں۔ پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے" ادھر ادھر دیکھ کر پھر اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ "دیکھو تمہیں میری قسم ہے میری موت کے بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ دنیا نگر میں ہمارے باغ ہیں.......بس.......اور دیکھو جب میں مر جاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا۔"

چند لمحات کے بعد منشی کریم بخش مر گیا، اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔
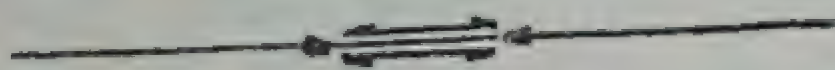
دو ہزار سال بعد

خاوند :- میں نے کہا ...... سنتی ہو۔
بیوی :- سن تو رہی ہوں - بولو۔
خاوند :- ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے کہ ....
بیوی :- مجھے یاد آیا یہ دھوبی تمہارے کالر کب استری کرکے لائے گا۔
خاوند :- لے آئے گا ____ آج کل بڑے دنوں کے باعث کام بھی تو بہت ہوگا اس کے پاس ____ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالم نے ......
بیوی :- اور وہ حلوہ سوہن کدھر گیا ____ مجھے کل اپنی سہیلیوں کی ٹی پارٹی کرنا ہے۔ بلقیس ناراض ہوجائیگی اگر تم حلوہ نہ لائے۔
خاوند :- لے آؤنگا۔ ٹی پارٹی آج تھوڑی ہے۔ کل لے آؤنگا چاندنی چوک

یہاں سے دور نہیں ــــــ ہاں تو ــــــ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے
بیوی :- ٹھیرو، تم نے جانے کی جو بات کہی تو مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی ــــــ میرا سویٹر بالکل پھٹ گیا ہے۔ اُدھر جاؤ گے تو ایک نیا لیتے آنا۔ نمبر تو تمہیں یاد ہی ہے۔
خاوند :- مجھے اپنا پُل اوور بھی لانا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور لیتا آؤں گا اور اگر تمہیں بہت جلدی ہے تو خود جا کر لے آؤ۔ نوکر کو ساتھ لے جانا ــــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا ــــــ ہاں، ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
بیوی :- تم چھوڑو اور باتوں کو ــــــ بھئی تمہارے اس نوکر نے مجھے بہت تنگ کیا ہے۔ پرلے درجے کا چوٹا ہے۔ بدزبان ہے اور مجھے خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس کا حساب صاف کرو ــــــ دو مہینے ہی کی تنخواہ تو ہے ــــــ اسکو چھٹی دو اور نیا نوکر تلاش کرو۔
خاوند :- کتنے نئے نوکر آ چکے ہیں۔ سب ایک جیسے ہی تھے ــــــ میں تو سمجھتا ہوں کہ نوکروں میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا اور اب جو تم کہتی ہو تو خیر مانے لیتا ہوں کل اس کا حساب چکا دوں گا اور نئے نوکر کے لئے اپنے چند دوستوں سے کہہ دوں گا ــــــ تو ــــــ تو ــــــ ہاں ــــــ تو میں اس عالم کی بات کہہ رہا تھا۔ وہ کہتا ہے

بیوی :- ٹھہرو ـــــ یہ منّے کے رونے کی آواز تو نہیں۔

خاوند :- نہیں تو ـــــ کیوں خیریت تو ہے؟

بیوی :- کل سے اس کے دشمنوں کی طبیعت خراب ہے تم تو سارا دن دفتر میں رہتے ہو اور دفتر سے آتے ہو تو کلب گھر چلے جاتے ہو تمہیں اسکی خیریت سے کیا واسطہ۔

خاوند :- لو بھئی تم نے تو گلے شکوے شروع کر دیئے، ـــــ چھوڑو ان باتوں کو اور سنو تمہیں ایک مزیدار بات سناتا ہوں ـــــ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی :- پہلے میری بات کا جواب دو۔

خاوند :- بولو؟

بیوی :- نہیں پھر پوچھوں گی ـــــ اچھا بھلا بتاؤ تو میری سالگرہ کب ہے۔

خاوند :- مجھے تاریخ اچھی طرح یاد ہے اور مجھے اپنا وعدہ بھی یاد ہے ـــــ تمہیں سالگرہ کے روز صبح سویرے اپنی پسند کی ساڑھی مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہوئیں ـــــ ہاں تو ـــــ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی :- ساڑھی وہی ہو جس پر مور بنے ہیں - بلوز کا کپڑا بھی وہی لوں گی - جو میں نے پسند کیا ہوا ہے ____ اچھا اب بتاؤ اس عالم نے کیا کہا ہے ؟

خاوند :- ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے کہ دو ہزار سال کے بعد دُنیا پر عورتوں کا راج ہو گا ۔ پر میں اب سوچتا ہوں کہ دو ہزار سال بعد کیوں ؟ ......

بہت خوب

fine

خونی تھوک

گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔
مسافروں کے گروہ کے گروہ پلیٹ فارم کے سنگین سینے کو روندتے ہوئے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے، پھل بیچنے والی گاڑیاں ربر ٹائر پہیوں پر موتی خاموشی سے تیر رہی تھیں۔ بجلی کے سینکڑوں قمقمے اپنی نہ جھکنے والی آنکھوں سے ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ برقی پنکھے سرد آہوں کی صورت میں اپنی ہوا پلیٹ فارم کی گدلی فضا میں بکھیر رہے تھے۔ دور ریل کی پٹڑی کے پہلو میں ایک لیمپ سرخ نگاہوں سے مسافروں کی آمد و رفت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا ــــــ پلیٹ فارم کی فضا سگرٹ کے تنا دھوئیں اور مسافروں کے شور میں لپٹی ہوئی تھی۔
پلیٹ فارم پر ہر ایک اپنی دھن میں مست تھا۔ تین چار بنچ پر بیٹھے اپنی ہونے والی سیر کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ایک گھڑی کے نیچے خدا معلوم کن خیالات میں غرق گنگنا رہا تھا، دور کونے میں نیا بیاہا جوڑا اپنی

ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خاوند اپنی بیوی کو کچھ کھانے کے لئے کہہ رہا تھا اور وہ شرما کر مسکرا دیتی تھی، پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر ایک نوجوان قلیوں کے ساتھ ساتھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا جو اسکی بہن کا تابوت اٹھائے ہوئے تھے، پانچ چھ فوجی سپاہی ہاتھ میں چھڑیاں لئے اور سیٹی بجاتے ہوئے ریفرشمنٹ روم سے شراب پی کر نکل رہے تھے، ایک سٹال پر چند مسافر اپنا وقت ٹالنے کی خاطر یونہی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھے۔ بہت سے قلی سرخ وردیاں پہنے گاڑی کی روشنی کا امید بھری نگاہوں سے انتظار کر رہے تھے ــــــ ریفرشمنٹ روم کے اندر ایک صاحب انگریزی لباس زیب تن کئے سگار کا دھواں اڑا کر وقت کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"قلیوں کی زندگی بھی گدھوں سے بدتر ہے!"

"مگر میاں کیا کریں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔"

"ایک قلی دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے۔"

یہی آٹھ دس آنے! ــــ"

"یعنی صرف جینے کا سہارا ــــ اور اگر بال بچے ہوں تو اپنا پیٹ کاٹ کر ان کا منہ بھریں۔ خالد خدا کی قسم جب ان لوگوں کی تاریک زندگی کا خیال ایک دفعہ بھی میرے دماغ میں آجائے تو پہروں یہی سوچتا ہوں کہ آیا انکی مصیبت ہماری نام نہاد تہذیب پر بدنما داغ نہیں ہے۔"

دو دوست پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

خالد اپنے دوست کی گفتگو سن کر قدرے متعجب ہوا اور مسکرا کر کہنے لگا

کیوں میاں یہ پینشن کب سے بنے ہو تم؟ ـــــ تہذیب کس بلا کا نام ہے ـــــ انسانیت کے سرد لوہے پر چڑھا ہوا زنگ! ـــــ جانے دو ـــــ ایسی باتوں کو جانتے ہو میں پہلے ہی سے اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں۔"

"خالد سچ کہہ رہے ہو۔ یہ باتیں واقعی دماغ کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دو روز ہوئے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ پندرہ مزدور کارخانے میں آگ لگ جانے سے جلے ہوئے کاغذ کی مانند راکھ ہو گئے۔ کارخانہ بیمہ شدہ تھا مالک کو روپیہ مل گیا مگر پندرہ عورتیں بیوہ بن گئیں اور خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہو گئے کل تین نمبر پلیٹ فارم پر ایک خاکروب کام کرتے کرتے گاڑی تلے آ کر مر گیا۔ کسی نے آنسو تک نہ بہایا ـــــ جب سے یہ واقعہ دیکھا ہے طبیعت سخت مغموم ہے یقین جانو حلق سے روٹی کا ٹکڑا نیچے نہیں اترتا۔ جب دیکھو اس خاکروب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش آنکھیں نکالے میری طرف گھور رہی ہے ـــــ مجھے اس کے گھر ضرور جانا چاہیے، شاید میں اس کے بچوں کی کچھ مدد کر سکوں۔"

خالد مسکرایا اور اپنے دوست کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا "جاؤ ـــــ پندرہ مزدوروں کی بیکس بیویوں کی مدد بھی کرو۔ یہ ایک نیک اور مبارک جذبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی شہر سے کچھ فاصلے پر چند ایسے لوگ بھی آباد ہیں جن کے پاس ایک وقت کے لئے سوکھی روٹی کا نصف ٹکڑا بھی میسر نہیں ـــــ گلیوں میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے سروں پر کوئی دست شفقت رکھنے والا نہیں، ایسی سینکڑوں عورتیں موجود ہیں جن کا حسن غربت کے کیچڑ میں گل سڑ رہا ہے ـــــ بتاؤ! تم کس کس کی مدد کرو گے؟ ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے

کس کس کی مٹھی بھرو گے؟ ——— ہزاروں ننگے جسموں میں سے کتنوں کی ستر پوشی کرو گے؟ ۔"

"آہ! درست کہتے ہو خالد!! ——— درست کہتے ہو، مگر بتاؤ! اس تاریک آندھی کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ ——— اپنے ہم جنس افراد کو ذلت کی زندگی بسر کرتے دیکھنا، ننگے سینوں پر چمکتے ہوئے بوٹوں کی ٹھوکریں لگتے دیکھنا ——— سخت بھیانک خواب ہے!۔"

"واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار کرو۔ یہ لوگ اپنی طاقت کے باوجود اس طوفان کو نہیں روکتے۔ خود اعتمادی نے انہیں برداشت کرنا سکھا دیا ہے چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کر دینا آسان ہے مگر چنگاری پیدا کرنا بہت مشکل ہے ——— بہرحال تمہیں امید رکھنی چاہئیے، شاید تمہاری زندگی ہی میں مصائب کے یہ بادل دور ہو جائیں ۔"

"میں یہ سہانا وقت دیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے بقایا سال نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاش یہی خیال باقی لوگوں کے دل میں بھی موجود ہوتا! ——— مگر یار گاڑی آج کچھ دیر سے آتی معلوم ہوتی ہے، دیکھو نا پٹڑی پر روشنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔"

خالد کا دوست کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھا اس لئے اس نے اپنے دوست کے آخری الفاظ بالکل نہ سُنے۔ اور اگر اس نے سنے تو کچھ خیال کر کے کہنے لگا ——— "واقعی یہ خیال پیدا کرنا چاہئیے اور اگر ——— "

"چھوڑو میاں اب اس فلسفے کو ——— کچھ پتہ بھی ہے گاڑی کب آنے والی ہے؟" خالد نے اپنے دوست کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"گاڑی" اور پھر سامنے والی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھا کر "نو بجکر پچیس منٹ" بس دس منٹ تک آجائے گی ——— یعنی دس منٹ کے بعد ہمارا دوست ہمارے پاس ہوگا۔ ذرا خیال تو کرو۔" میں وحید کی آمد اس دردناک گفتگو کی وجہ سے بالکل بھول چکا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے خالد کے دوست نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مسافر بڑی سرعت سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ قلی اسباب کے ڈھیروں کے پاس خاموش کھڑے گاڑی کے منتظر تھے کہ جلدی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک آنہ حاصل کر سکیں۔ خوانچہ والے دوسرے پلیٹ فارموں سے جمع ہو کر اپنی مخصوص صدا بلند کر رہے تھے۔ فضا گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، مختلف انجنوں کی بھپ بھپ، خوانچہ والوں کی صداؤں، مسافروں کی باہم گفتگو کے شور اور قلیوں کی بھدّی آوازوں سے معمور تھی ——— برقی پنکھے بدستور آہیں بھر رہے تھے۔

ریفرشمنٹ روم کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر نے جو ابھی سگار کو دانتوں میں دبائے کش لے رہا تھا۔ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف بڑی بے پروائی کے انداز میں دیکھا اور بازو کو جھٹکا دے کر مرمریں میز پر سہارا دیتے ہوئے بلند آواز میں بولا "بوائے۔"

تھوڑی دیر خادم کا انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چیخا۔ "بوائے، بوائے"
اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے "نمکحرام"

"جی آیا حضور"۔ دوسرے کمرے میں سے کسی کی آواز آئی۔
ساتھ ہی سپید لباس پہنے ایک خادم بھاگ کر اس مسافر کے قریب مودب کھڑا ہو گیا۔

"حضور"

"ہم نے تمہیں دو دفعہ آواز دی ــــ سوئے رہتے ہو تم لوگ شاید!"

"حضور میں نے سنا نہیں ورنہ کیا مجال ہے کہ غلام حاضر نہ ہوتا۔"
غلام کا لفظ سن کر مسافر کا غصہ فرو ہو گیا۔

دیکھو درجۂ اول کے مسافروں سے یہ بے رخی اچھی نہیں، ہم تمہارے بڑے صاحب کے بھی کان کھینچ سکتا ہے۔ سمجھے۔"

"جی ہاں"

ایجنٹ کے! ــــ وہ ہمارا دوست ہے ــــ خیر! دیکھو تم ویٹنگ روم میں جاؤ اور ہمارے قلی سے کہو کہ وہ صاحب کا تمام اسباب پلیٹ فارم پر لے جائے گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہیں۔"

"بہت اچھا حضور!"

"اور ہاں ہمارا بل دوسرے آدمی کے ہاتھ بھجوا دو۔"

"دیکھو! ــــ بل میں پانچ سو پچپن نمبر سگریٹ کے ایک ڈبے کے دام بھی شامل کر لینا ــــ پانچ سو پچپن نمبر کا ڈبہ، خیال رہے۔"

"بل اور ڈبہ گاڑی میں لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ وقت تھوڑا ہے۔"

جو مرضی میں آئے کرنا، مگر اب تم جاؤ اور جلد ہمارے قلی کو اسباب نکالنے کے لئے کہہ دو۔"

مسافر نے یہ کہہ کر ایک انگڑائی لی اور میز پر پڑے ہوئے شراب کے گلاس میں سے آخری گھونٹ ایک ہی جرعے میں ختم کر دیئے گیلے ہونٹ ایک بے داغ ریشمی رومال سے صاف کرنے کے بعد وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔

صاحب، کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک خادم نے جلدی سے دروازہ کھول دیا مسافر بڑی رعونت سے ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

دور ریل کی آہنی پٹریوں کے درمیان خیرہ کن روشنی کا ایک دھبہ نظر آ رہا تھا جو آہستہ آہستہ آس پاس کی تاریکی کو چیرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دھبہ روشنی کی ایک لمبی دھاری میں تبدیل ہو گیا اور دفعتہً انجن کی چوندھیا دینے والی روشنی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے قمقموں کو اندھا بناتی ہوئی گل ہو گئی۔ ساتھ ہی کچھ عرصے کیلئے انجن کے آہنی پہیوں کی بھاری گڑگڑاہٹ تلے پلیٹ فارم کا شور دب کر رہ گیا ایک چیخ کے ساتھ گاڑی اسٹیشن کے چبوترے کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔

پلیٹ فارم کا دبا ہوا شور انجن کی گڑگڑاہٹ سے آزاد ہو کر ایک نئی تازگی سے بلند ہوا۔ مسافروں کی دوڑ دھوپ، بچوں کے رونے کی آواز، قلیوں کی

بھاگ دوڑ، اسباب نکالنے کا شور، ٹھیلیوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ خوانچہ والوں کی بلند صدائیں، شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی دلخراش چیخیں اور بھاپ نکلنے کی شاں شاں پلیٹ فارم کی آہنی چھت تلے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے تیر رہی تھی۔

"خالد۔ وحید کو دیکھا تم نے کسی ڈبے میں؟"

"نہیں تو"

"خدا جانے اس گاڑی سے آیا بھی ہے یا نہیں۔"

"تار میں تو اسی گاڑی کا ذکر تھا ———— ارے وہ ڈبہ میں کون ہے؟ وحید!"

"ہاں، ہاں وحید۔"

دونوں دوست بھاگتے ہوئے اس ڈبے کی طرف بڑھے جس میں سے وحید اپنا اسباب اتروا رہا تھا۔

ریفرشمنٹ روم والا مسافر تیزی سے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا باہر دروازے کے برابر لگے ہوئے کاغذ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور پیتل کی ایک سلاخ پکڑ کر قلی اور اپنے اسباب کا انتظار کرنے لگا۔

قلی اسباب سے لدا ہوا، گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دوڑا چلا آ رہا تھا۔ مسافر نے اسے دیکھا اور جھلا کر بلند آواز میں کہا۔

"ابے اندھے ادھر آ۔"

قلی نے مسافر کی آواز پہچان کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، مگر بھیڑ میں خود مسافر کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ابھی اسی پریشانی میں تھا کہ ایک اور آواز آئی۔"کیوں نظر نہیں آرہا کیا؟ ——— اِدھر اُدھر ——— ناک کی سیدھ!"

قلی نے مسافر کو دیکھ لیا اور اسباب لے کر اس کے ڈبے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب ایک طرف ہٹ جائیے، میں اسباب اندر رکھ دوں۔"

"ہاں رکھو۔" مسافر دروازے کے قریب ایک گدے دار نشست پر بیٹھ گیا، "مگر اتنا عرصہ سو رہے تھے کیا؟ خانسامہ نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب کا سامان اٹھا کر گاڑی آتے ہی فوراً ڈبے میں رکھ دینا۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کس ڈبے میں سوار ہو گئے۔" قلی نے ایک بھاری ٹرنک بالائی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈبہ ہمارا ریزرو ہے۔ باہر چٹ پر ہمارا نام بھی لکھا ہوا ہے۔"

"آپ نے پہلے ہی یہ کہا ہوتا تو ہرگز دیر نہ ہوتی ——— ایک، دو، تین ——— آٹھ ——— اور یہ دس۔" قلی نے اسباب کی مختلف اشیا گننا شروع کر دیں۔

سامان قرینے سے رکھنے کے بعد قلی نے اپنے اطمینان کیلئے ایک بار پھر رکھی ہوئی چیزوں پر نگاہ ڈالی اور ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔

"صاحب اپنا سامان پورا کر لیجئے۔"

مسافر نے بڑی بے پروائی سے اپنی جیب سے ایک نفیس بٹوہ نکالا اور

ابھی کھول کر مزدوری ادا کرنے والا ہی تھا کہ اسے کچھ یاد آیا۔

"ہماری چھڑی کہاں ہے؟"

"چھڑی —— چھڑی تو آپ ہی کے پاس تھی۔"

"میرے پاس ایک تا کیا ہے —— وہیں چھوڑ آیا ہو گا تو۔"

"چھڑی آپ کے پاس تھی —— مگر صاحب اس سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں، جب میں نے کوئی خطا نہیں کی ——"

قلی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سن کر مسافر آگ بگولا ہو گیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر چلانے لگا۔

"سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں —— کسی نواب کا بچہ ہے! جتنے کی چھڑی ہے اتنی تو تیری اپنی قیمت بھی نہیں۔ چھڑی لے کر آتا ہے یا نہیں؟ چور کہیں کا۔؟"

چور کے لفظ نے قلی کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس کے جی میں آئی کہ اس مسافر کی ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچ لے اور اسے اس اکڑفوں کا مزا چکھا دے۔ مگر طبیعت پر قابو پا کر خاموش ہو گیا اور نرمی سے کہنے لگا۔

"آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے —— چھڑی آپ نے کہیں رکھ دی ہو گی، مجھے بتائیے میں وہاں سے لے آؤں۔"

گویا میں بیوقوف ہوں —— میں کہہ رہا ہوں چھڑی لے کر آ، ورنہ ساری شیخی کرکری کر دوں گا۔"

قلی ابھی کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اسے چند قدم کے فاصلے پر

خانساماں نظر آیا جو ہاتھ میں سگرٹ کا ڈبہ اور چھڑی لئے چلا آ رہا تھا۔
"چھڑی خانساماں لے کر آ رہا ہے اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر برس رہے ہیں۔"
"بکو مت ـــــــ کتّے کی طرح چلا رہا ہے۔"
یہ سن کر قلی غصّے سے بھرا ہوا مسافر کی طرف بڑھا۔ مسافر نے پورے زور سے اس کے بڑھتے ہوئے سینے میں اپنے نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھاتے ہی قلی چکراتا ہوا سنگین فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔
قلی کو گرتے دیکھ کر بہت لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔
"بیچارے کو سخت چوٹ آئی ہے۔"
"یہ لوگ بہانہ بھی کرتے ہیں۔"
"منہ میں سے شاید خون نکل رہا ہے۔"
"معاملہ کیا ہے۔"
"اس آدمی نے اسے بوٹ سے ٹھوکر ماری ہے۔"
"کہیں مر نہ جائے بیچارہ"
"کوئی دوڑ کر پانی کا ایک گلاس تو لائے۔"
"بھئی ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو۔ ہوا تو آنے دو۔"
قلی کے گرد جمع ہوتے ہوئے لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد خالد اور اس کا دوست بھیڑ چیر کر گرے ہوئے مزدور کے قریب ہو پہنچے۔ خالد نے اسکے سر کو اپنے گھٹنوں پر اٹھا لیا اور اخبار سے ہوا دینا

شروع کر دی۔ پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مسعود وحید سے کہہ دو کہ اب ہم اس سے گھر پر مل سکیں گے اور ہاں اس ظالم کو دیکھنا کہاں ہے۔ گاڑی چلنے والی ہے کہیں چلا نہ جائے۔"

یہ سنتے ہی لوگ اس مسافر کے ڈبے کے پاس جمع ہو گئے جو کھڑکی کے پاس بیٹھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار پکڑے پڑھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا

مسعود اپنے دوست وحید سے رخصت ہو کر اس مسافر کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے قریب جا کر نہایت شائستگی سے کہا آپ یہاں اخبار بینی میں مصروف ہیں اور وہ بیچارہ بے ہوش پڑا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں"

"چلئے اور کم از کم اس کی حالت تو ملاحظہ کیجئے۔"

"کمبخت نے میرے سفر کا تمام لطف بدمزہ کر دیا اور پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے۔" چلئے صاحب ——— یہ مصیبت بھی دیکھنا تھی۔"

خالد بے ہوش قلی کا سر تھامے اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ جھکے ہوئے خالد اور قلی کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہے تھے۔

"خالد آپ تشریف لے آئے ہیں۔" مسعود نے مسافر کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔"

"ہاں جناب ——— یہ ہے آپ کے ظلم کا شکار ——— کسی ڈاکٹر کو ہی بلوا لیا ہوتا آپ نے۔" مسعود نے مسافر سے کہا۔

مسافر قلی کے زرد چہرے اور لوگوں کا گروہ دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا

اور گھبراتے ہوئے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا۔

مسافر ابھی بٹوہ نکال ہی رہا تھا قلی کا جسم متحرک ہوا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول کر ہجوم کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

"یہ نوٹ آپ اسے میری طرف سے دے دیجئے گا۔ میں جا رہا ہوں گاڑی کا وقت ہو گیا ہے" مسافر نے مسعود کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے انگریزی زبان میں کہا اور پھر قلی کو ہوش میں آتا دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔ "ہم نے اس غلطی کی قیمت ادا کر دی ہے۔"

قلی یہ سن کر تڑپا۔ منہ سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے یہ چند الفاظ اپنی زخمی چھاتی پر زور دیکر ادا کئے:۔

میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں ..... دس روپے ...... ایک انسان کی جان کی قیمت ...... میرے پاس بھی کچھ ہے ..... جو ......

باقی الفاظ اس کے خون بھرے منہ میں بلبلے بن کر رہ گئے مسافر قلی کی یہ حالت دیکھ کر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا۔ "میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

قلی نے بڑی تکلیف سے مسافر کی طرف رخ پھیرا اور منہ سے خون کے بلبلے نکالتے ہوئے کہا:۔

"میرے پاس ...... بھی ...... کچھ ہے ...... یہ لو ......"

یہ کہتے ہوئے اس نے مسافر کے منہ پر تھوک دیا۔ تڑپا اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا خالد کی گود میں سرد ہو گیا

مسافر کا منہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا۔

خالد اور مسعود نے لاش دوسرے آدمیوں کے حوالے کرکے مسافر کو پکڑ کر پولیس کے سپرد کر دیا۔

* * * * * * * *

مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔

آخر فیصلہ سنا دیا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو تھوڑا سا جرمانہ کرنے کے بعد بری کر دیا۔ فیصلہ میں یہ لکھا تھا کہ قلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔

فیصلہ سناتے وقت، خالد اور مسعود بھی موجود نہ تھے۔ ملزم ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"قانون کا قفل طلائی چابی سے کھل سکتا ہے۔"

"مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے۔"

"خالد اور اس کا دوست باہر برآمدے میں گفتگو کر رہے تھے۔"

تین تحفے
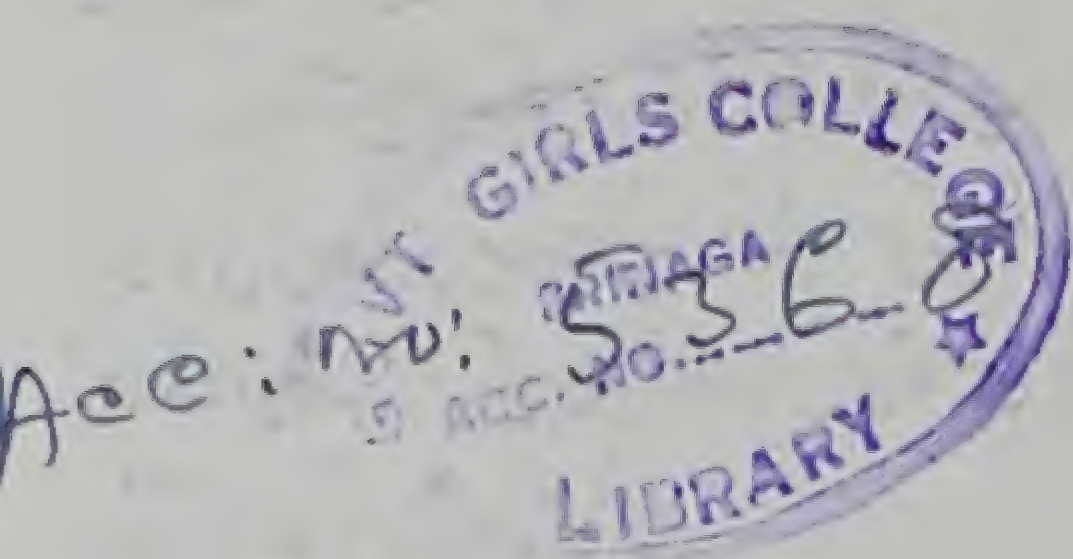
راگ اور محبت دل پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں۔ دونوں کے سُر ایک جیسے نرم و نازک اور تیز و تُند ہیں؛ دونوں میں تلخی و شیرینی پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتی ہے دونوں رُوح کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ موسیقی محبت سے زیادہ طاقتور ہے ——— وادیٔ نیل میں پہلی بار قدم رکھنے والی رقاصہ نبیلا راگ اور محبت کے ہر سُر کی خفیف سے خفیف لرزش سے واقف تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ مصر کے سب سے بڑے معبد کی مشہور مغنیہ پلینگو بھی اُس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

سات برس تک وہ وادیٔ نیل کی رنگین فضاؤں میں اپنی زندگی کا کوئی نیا سپنا دیکھے بغیر سانس لیتی رہی ——— سات برس تک وہ اپنی زندگی کا ایک ہی ورق پڑھتی رہی اور اُسے نیا باب کھولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مگر جونہی اس کا شباب نے بیسویں منزل میں قدم رکھا اُمنگیں دوڑ کر اس کے سینے میں داخل ہو گئیں اور اس کی کتاب زندگی کے نئے اوراق مچلنے لگے ——— اس کا شباب جو کہ پہلے گونگا تھا بولنے لگا اور اس کے کان دنیا کی دوسری آوازوں پر متوجہ ہو کر لگی جو

کی باتیں سننے میں مشغول ہو گئے۔

ایک صبح جب کہ سورج کی کنواری کرنیں دریائے نیل میں نہا رہی تھیں نبیلا جوانی کی بھاری نیند سے بیدار ہوئی۔ اس کے سنبھالے نہ سنبھلنے والے شباب نے اُسے تھکا دیا تھا۔ اس کی برمی خادمہ پاس ہی قالین پر بیٹھی اسکی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے یہ گیت گا رہی تھی :-

گیت

سحر کی طرح خنک اور جاں فزا ہو تم
کہ یک مجسمۂ نکہت و ضیا ہو تم
گھنی بھویں ہیں تمہاری دراز پلکیں ہیں
کسی حسین مصور کی التجا ہو تم
تمہاری آنکھوں سے یوں جھانکتی ہے موسیقی
کہ جیسے جسم کے بربط میں اک نوا ہو تم (عدم)

(وہ یہ گاتی ہے کہ نبیلا مضطرب ہو کر اس سے کہتی ہے)

نبیلا:- جالا ــــــ بربط اتار دے۔ سازوں کے تار توڑ ڈال۔ اپنے گلے میں سُر کو ہمیشہ کے لئے دبا دے اور آ ُ میرے ساتھ رو۔ اس دن کا ماتم کر جب نبیلا پیدا ہوئی تھی۔

جالا:- آج پھر جذبات میں وہی طوفان آیا ـــــ میں جانتی تھی کل کی خاموشی ضرور رنگ لائے گی۔

نبیلا:- میں تجھ سے کیا کہوں جالا ــــــ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ اور جوانی

یوں ہی بیتی چلی جا رہی ہے۔ رنگینیوں کے بغیر ------ دل سے کوئی ہوک نہیں اٹھتی۔ جگر میں کوئی ٹیس نہیں ہوتی ------ ہونٹ نہیں مسکراتے یہ آنکھیں نہیں روتیں۔

جالا:۔ پھول پیدا ہوتا ہے خوشبو دینے کے لئے جنگل میں رہے یا باغ میں، شاخ پر رہے یا کسی کے بستر پر خوشبو دیتا ہی رہے گا۔ تو پھول ہے۔ نیلا جو حسن کی ٹہنی پر کھلا ہے۔ یہ خواہش نہ کر کہ تجھے کوئی توڑ کر مسل دے۔

نیلا:۔ جو مستی شراب بھرے پیالے کے ٹوٹنے میں ہے بند صراحی میں نہیں ہے ---- انگوروں کو مسل کر شراب بنائی جاتی ہے اور پھول جب مسلے جاتے ہیں تو ان سے عطر بنتا ہے۔

جالا:۔ (ستار کے تار چھیڑ کر) کل رات جو آیا تھا ------ وہ پھول لیکر

نیلا:۔ سب کے سب مرجھا گئے ------ کون لے کر آیا تھا ------ کب آیا تھا مجھے کچھ یاد نہیں رہا ------ مجھے نیند آ رہی تھی ------ کیا پھر آئیگا۔ نہیں مجھے کچھ نہ بتاؤ۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ ------ لاؤ مجھے میری چوڑیاں دو

(جالا چوڑیاں دیتی ہے)

نیلا:۔ جالا چوڑیاں کھنکھناتی ہیں پر میری زندگی کس قدر خاموش ہے۔ میری کتنی خواہش ہے کہ میری کشتی موجوں میں گھر کر تھپیڑ کھائے۔

جالا:۔ ہر دن نیا تھپیڑ لاتا ہے

نیلا:۔ نہیں جالا تو نہیں سمجھتی ------ دنیا میں ہر جگہ دیوتا آسمان سے اتر کر عورتوں سے محبت کرتے رہے ہیں ------ میں کن آنکھوں سے انکی راہ دیکھوں کن جگنوؤں

میں انہیں تلاش کروں۔ کونسی دعائیں مانگوں کہ وہ میرے پاس آئیں
وہ جو یا تو مجھے کچھ سکھائیں یا سب کچھ بھلا دیں۔ اگر یہ دیوتا اپنے شہ نشینوں میں
اوندھے پڑے رہے تو جالا کیا میں ایسا رفیق دیکھے بغیر مر جاؤں گی جو میری زندگی
میں ہولناک حادثے برپا کر سکے۔

جالا :۔ تیرے سپنے بڑے انوکھے ہیں۔

نبیلا :۔ اور سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ اگر کسی نے مجھ سے محبت کی تو میری
سب سے بڑی خواہش یہ ہوگی کہ وہ میری محبت کے نیچے پس جائے وہ لوگ
جواب میرے پاس آتے ہیں اس قابل نہیں کہ میری آنکھیں ان کے لئے ایک ننھا
سا آنسو بھی اُگلیں ——— میری جوانی ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں ہے
جو ساتھی سے کچھ زیادہ ہو ——— جو میری زندگی میں ہلچل مچا دے۔

جالا :۔ تیری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ پر مجھے ڈر ہے کہ کوئی بہت بڑا حادثہ
برپا ہوگا ——— سمندر کی زبان جب خاموش ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ
وہ بہت بڑے طوفان کا پیغام دے رہی ہے۔

نبیلا :۔ وہ طوفان کب آئے گا، جالا؟

جالا :۔ جب دو الگ الگ رستوں پر چلنے والے تارے آپس میں ٹکرا جائیں گے

مخالف سمت چلنے والا ستارہ، ویتا صنم تراش تھا ——— مصر کی ملکہ اس خوبصورت
نوجوان کی محبت میں گرفتار تھی اس لحاظ سے وہ وادیٔ نیل کا مالک تھا مصر کے
سب سے بڑے معبد کے لئے حسن و عشق کی مورتی اسی چابک دست بت ساز نے

تیار کی تھی — اس کا حسن اور اسکی صنعت دونوں پوجے جاتے تھے اسکی بنائی ہوئی مورتی پر مصر کی حسین ترین عورتیں رنگا رنگ کے پھول قسم قسم کے پھل اور سہرنا کی کبوتریاں چڑھاوا چڑہاتی تھیں جن کے پر ناز و ادا کے مانند اُجلے اور پیر بوسوں کے مانند سرخ ہوتے تھے — وادیٔ نیل کی ہر دوشیزہ اپنی کتاب محبت دمیتا کے اس بت کے سامنے کھولنا اپنا فرض سمجھتی تھی - یوں کہئے کہ مصر کا یہ حسین بت تراش وہاں کی ہر حسین عورت کے دل میں دھڑکن بن کر سما گیا تھا -

جس راستے سے اس کا گذر ہوتا تھا اس پر کئی پرستار عورتیں اپنا نام لکھ دیتی تھیں اور وہ ان کو پڑھے بغیر گزر جاتا تھا - اسکی ڈھیلی قبا ان ناموں کو اکثر مٹایا کرتی تھی - اگر کسی روز وہ مسلے ہوئے پھول کی پتیاں بکھیرتا آگے بڑھ جاتا تو عورتیں اُن پر ٹوٹ پڑتی تھیں اور تبرک کے طور پر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھیں -

اُس کے پاس دولت تھی ، حسن تھا ، جوانی تھی ، ملکہ مصر اسکی ایک ادنی کنیز تھی - مگر وہ ناخوش تھا - وہ خود کو ایک ایسی کھیتی سمجھتا تھا ، جو مسلسل بارش کے باعث دلدل بن جائے وہ محبت کئے جانے سے گھبرا کر خود محبت کرنا چاہتا تھا اور آج ان ہی خیالات میں غرق دمیتا نیل کے کنارے ڈوبتے ہوئے سورج میں اپنی موجودہ زندگی کا عکس دیکھ رہا تھا کہ نیلا زیورات سے لدی پھندی اپنی چال سے آپ ہی مست ہوتی اُس کے پاس سے گزری

دمیتا نے منہ پھیر لیا - نیلا کے گہنوں سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی طوائف ہے اس لئے اُس کے سلام سے بچنے کے لئے اپنا منہ موڑ لیا تھا وہ اسکی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مصر کی حسین عورتوں کے بے نقاب چہرے دیکھ دیکھ کر وہ اُکتا

چکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل میں اکساہٹ پیدا ہوئی اور اس نے کنکھیوں سے نبیلا کی طرف دیکھا جو چہرے پر زرد رنگ کی نقاب ڈالے دریائے نیل کے زرنگار پانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے دمیتا ـــــ مصر کے سب سے خوبصورت نوجوان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ـــــ اس نے مصر کے سب سے بڑے بت ساز کی موجودگی کی پرواہ تک نہ کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف ہوا میں تازگی اور ٹھنڈک ڈھونڈ رہی ہے اور شام کی فضا کے ارتعاش سے اپنا دل بہلانا چاہتی ہے۔

دمیتا کے سینے میں ہیجان پیدا ہو گیا ـــــ یہ عورت اس وقت نیل کے کنارے کیا کرنے آئی تھی ـــــ کسے ڈھونڈ رہی تھی ـــــ اس کو دیکھ کر اس کے قدم رک کیوں نہ گئے ـــــ اس نے یقیناً اسے دیکھا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزری تھی تو اسے ملکۂ مصر کے محبوب کی موجودگی کا علم تھا۔ مگر وہ آداب بجا لائے بغیر بے پروا ہوا کے مانند پاس سے گزر گئی ـــ کیوں ـــ کیوں ـــــ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نبیلا لوٹی ـــــ اسی دلکش انداز سے ـــ دمیتا سے نہ رہا گیا ـــــ وہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

دمیتا:۔ اے تیز رو حسینہ میرا سلام قبول کر

نبیلا:۔ کر لیا

دمیتا:۔ یہ تیز قدم تجھے کدھر لئے جا رہے ہیں

نبیلا:۔ واپس

دمیتا:۔ بالکل اکیلی

نیلا:۔ بالکل اکیلی

دیوتا:۔ اپنے شوہر کے پاس

(نیلا قہقہہ لگا کر ہنستی ہے)

دیوتا:۔ سورج دریائے نیل میں غوطہ لگا گیا ہے۔ اب اندھیرے میں تو کسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

نیلا:۔ مجھے کسی کی تلاش نہیں —— میں اکیلی سیر کے لئے نکلی ہوں۔

دیوتا:۔ لیکن یہ زیور تونے صرف اپنا دل خوش کرنے کے لئے نہیں پہنے —— اور یہ نیلا نقاب۔

نیلا:۔ میں نے یہ زیور صرف اپنی خوشی کے لئے پہنے ہیں اس لئے کہ یہ بتاتے ہیں میں خوبصورت ہوں اور چلتے ہوئے میں اپنی نازک انگلیوں کی طرف دیکھتی ہوں جو ان انگوٹھیوں کی شان دوبالا کرتی ہیں۔

دیوتا:۔ تیرے ان ہاتھوں میں ایک آئینہ ہونا چاہئے جس میں تو صرف اپنی آنکھیں دیکھتی رہے —— یہ آنکھیں —— اف یہ آنکھیں ——

نیلا:۔ ان آنکھوں میں اب نیند آگئی ہے —— میں تھک کر چور ہو گئی ہوں —— مجھے اب جانا چاہئے۔

دیوتا:۔ کس راستے سے کدھر۔

نیلا:۔ میں ہرگز نہیں بتاؤں گی —— واہ تونے مجھ سے یہ پوچھا تک نہیں کہ اس میں میری خوشی ہے کہ نہیں —— کس راستے سے کدھر —— کیا بے تکلفی سے تونے یہ کہہ دیا —— کیا تو سمجھتا ہے کہ

میں ایک بازاری عورت ہوں ــــ تجھے معلوم ہے کہ مصر میں کن کن دروازوں پر میرا استقبال ہوتا ہے ــــ تو نے کیا وہ تمام آدمی شمار کیے ہیں جو نبیلا کے التفات کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں ــــ کس راستے سے کدھر ــــ میں تجھے ہرگز نہیں بتاؤں گی یہیں کھڑا رہ یا چلا جا۔ میری ہمرکابی کا شرف تجھے ہرگز نصیب نہ ہوگا۔

دیلتا :۔ تو شاید نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔

نبیلا :۔ میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں ــــ تو دیلتا سنگتراش ہے۔ تیرے ہاتھوں نے اس دیوی کی مورتی تیار کی ہے جسکو میں پوجتی ہوں، تو ملکۂ مصر کا عاشق ہے اور اس شہر کا مالک، پر میری نظروں میں تو ایک حسین غلام ہے اس لئے کہ آج تو نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میری محبت میں گرفتار ہو گیا ہے ــــ میری طرف یوں گھور گھور کے نہ دیکھ، کچھ کہنے کی کوشش نہ کر، میں جانتی ہوں تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی ملکہ تجھ سے محبت کیجاتی رہی ہے ــــ پر اب تو میری محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس وقت سر جھکائے تو میری گھنی پلکوں کی خوبصورتی پر غور کر رہا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میرے ہونٹ کتنے نازک ہیں۔ میرے بال کس قدر ملائم ہیں۔ جن باتوں پر تو آج غور کر رہا ہے ان پر لاکھوں آدمی ایک زمانے سے غور کر رہے ہیں۔ میرے حسن کے چرچے مصر کے ذرے ذرے کی زبان پر ہیں پچھلے برس میں نے بیس ہزار آدمیوں کے سامنے رقص کیا اور مجھے معلوم ہے کہ تو ان خوش قسمت آدمیوں میں موجود نہیں تھا ــــ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو چھپاتی ہوں ــــ نہیں ــــ مغل پر سب میرے چندھیا دینے والے

حسن کی بہار دیکھ چکے ہیں ــــ لیکن تو ــــ ایک طرف تو مجھے
پھر کبھی نہیں دیکھے گا۔ جو کچھ کہ میں ہوں، جو کچھ کہ میں محسوس کرتی ہوں
میری محبت میرے حسن کی بابت تو کچھ بھی نہ جان سکے گا ــــ تو ایک
حقیر، پست، چھچھورا، ظالم، بے حس اور بزدل انسان ہے ــــ مجھے حیرت
ہے کہ ابھی تک کسی عورت کے دلمیں اتنی نفرت کیوں پیدا نہیں ہوئی
کہ وہ تجھے اور ملکۂ مصر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔

(دیبتا اور نبیلا چند لمحات کے لئے خاموش کھڑے رہتے ہیں)

دیبتا:۔ دیبتا کے ساتھ چلنے سے انکار کرکے جو تو نے شان پیدا کی ہے بالآخر
تیرے لئے بہت مہنگی ثابت ہوگی ــــ میں پوچھتا ہوں، تجھے ڈر کس بات کا ہے،

نبیلا:۔ تو جو کہ دوسروں کی محبت کا عادی ہے کیا بتا سکتا ہے کہ اس
عورت کو کیا دینا چاہئے جو محبت نہ کرتی ہو۔

دیبتا:۔ میں تیرے قدموں پر مصر کا سارا سونا ڈھیر کردوں گا۔

نبیلا:۔ اس سے زیادہ سونا میرے بالوں میں ہے ــــ مجھے سونا نہیں
چاہئے مجھے صرف تین چیزوں کی خواہش ہے کیا تو دے سکتا ہے

دیبتا:۔ بول وہ تین چیزیں کیا ہیں۔

نبیلا:۔ مجھے چاندی کا ایک آئینہ چاہئے کہ اس میں ہر روز اپنی آنکھوں کا
خمار دیکھا کروں

دیبتا:۔ تجھے مل جائے گا۔ بول جلدی بول باقی دو چیزیں کیا ہیں

نبیلا:۔ مجھے ہاتھی دانت کی ایک کنگھی چاہئے جو میرے بالوں میں

اس طرح غوطے لگائے جیسے کرنوں بھرے پانی میں ماہی گیروں کے جال۔

دیوتا:۔ تیسری چیز

نبیلا:۔ موتیوں کی ایک مالا جسے پہنکر میں تیرے لئے سہاگ کا ناچ ناچونگی

دیوتا:۔ بس

نبیلا:۔ مجھے یہ مالا مل جائے گی نا؟

دیوتا:۔ جیسے تو چاہے گی۔

نبیلا:۔ جیسی میں چاہونگی۔ میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔ بول اب

میں کیا اپنے تحفے انتخاب کر لوں۔

دیوتا:۔ کیوں نہیں۔

نبیلا:۔ کیا تو قسم کھاتا ہے کہ مجھے یہ چیزیں لادے گا۔

دیوتا:۔ میں قسم کھاتا ہوں۔

نبیلا:۔ کس کی

دیوتا:۔ جس کی تو کہے۔

نبیلا:۔ حسن و عشق کی اس دیوی کی قسم کھا جسکی مورتی تونے تیار کی ہے

دیوتا:۔ میں اسی کی قسم کھاتا ہوں

نبیلا:۔ تو میں نے اپنے تحفے چن لئے

دیوتا:۔ اتنی جلدی

نبیلا:۔ واقعی میں نے اپنے تحفے بہت جلدی چنے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ

میں چاندی کا کوئی ایسا آئینہ قبول کرونگی جو مصر کے بنجارے بازاروں میں

بیچتے پھرتے ہیں ـــــ مجھے وہ آئینہ چاہیئے جس میں یونان کی مشہور شاعرہ سیفو اپنا چہرہ دیکھتی رہی ہے اور جو اب یہاں کی مشہور طوائف سارہ کے پاس ہے وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تو اسے چرا لائے گا

دیمیا: یہ سراسر دیوانگی ہے ـــــ تو چاہتی ہے کہ میں چوری کروں۔

نبیلا: میں یہ سمجھتی تھی کہ مرد اپنے قول پر قائم رہا کرتے ہیں۔

دیمیتا: میں اپنے قول پر قائم ہوں ـــــ آگے بول۔

نبیلا: اور یہ جو ہاتھی دانت کی کنگھی میں تجھ سے مانگ رہی ہوں معمولی کنگھی نہیں ـــــ یہ وہ کنگھی ہے جو یہاں کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی اپنے بالوں میں لگائے رکھتی ہے۔ یہ کنگھی اس ملکہ کے پاس تھی جو آج سے پانچسو برس پہلے وادیٔ نیل پر حکمران تھی۔

دیمیتا: پر میں یہ حاصل کیسے کروں گا۔

نبیلا: اس کو قتل کر کے ـــــ یہ کنگھی مجھے کل دوسرے تحفوں سمیت مل جانی چاہیئے۔

دیمیتا: پہلے چوری پھر قتل ـــــ چلو ایسا ہی سہی۔

نبیلا: تیسرا تحفہ موتیوں کا وہ مالا ہے جو تیرے ہاتھ کی بنائی مورتی کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔

دیمیتا: تو حد سے بڑھ گئی ہے نبیلا ـــــ سن لے، تجھے کچھ نہیں ملے گا نہ آئینہ، نہ کنگھی اور نہ موتیوں کی مالا ـــــ تو میرے جذبات کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں کھیل سکتی۔

نیلا:۔ تیری زبان جو کچھ کہتی ہے اُس کو تیرا دل نہیں مانتا
اپنے آپ کو دھوکا نہ دے ـــــ یہ تینوں تحفے تو کل مجھے یقیناً لا دیگا۔
پھر تو میرے پاس آیا کریگا ـــــ ہر شام کو ـــــ اور میں مقررہ وقت
پر سولہ سنگھار کئے تیری راہ دیکھا کرونگی ـــــ میرا لباس تیری مرضی کے
مطابق ہوگا۔ میرے بال تیری خواہش کے مطابق گوندھے جائیں گے۔ میں
تیرے پیار کے لئے تیار رہا کرونگی جیسے سیپی سمندر کی گود میں بارش کے قطرے
پینے کے لئے تیار رہتی ہے ـــــ اگر تو نرم و نازک محبت چاہے گا تو میں تجھے
بچوں کے مانند کھلاؤں گی۔ اگر تو چاہے گا کہ میں خاموش رہوں تو میں
چاندنی راتوں کی طرح چپ چاپ رہونگی اور جب تیری خوشی ہوگی کہ
میں گاؤں تو تیرے کان ملک ملک کے گیت سنیں گے۔ مجھے ایسے گیت
یاد ہیں جو چشموں کے آبی نغموں سے بھی دھیمے ہیں۔ اور ایسے گیت بھی
یاد ہیں جو کڑکتی بجلی سے بھی زیادہ خوفناک ہیں مجھے ایسی سیدھی سادی
اور ترو تازہ بولیاں بھی آتی ہیں جو کنواری لڑکیاں اپنی ماؤں کو
سنا سکتی ہیں اور ایسی غزلیں بھی یاد ہیں جو صرف تنہائی میں سنی جاتی ہیں
اگر تو کہے گا تو رات رات بھر میں تیرے حضور میں ناچونگی۔ ایسے ناچ
جو تیتلیوں کو تھرکنا بھلا دیں اور عود کے دھوئیں کو پریشان کر دیں۔۔
ملکۂ مصر دولتمند ہے مگر اس کے محل کے اندر ایسا کوئی بھی کمرہ نہیں جو میرے
حجلۂ خاص کا مقابلہ کر سکے ـــــ اس کے اندر سجاوٹ اور زیبائش کے
ایسے سامان ہیں جن کی تعریف کے لئے بڑے بڑے شاعر آج تک لفظ

نہیں ڈھونڈ سکے ــــــ اور تو جانتا ہے سب سے بڑی سجاوٹ کون ہے
نبیلا جس سے تو محبت کرتا ہے، پر اُسے اچھی طرح نہیں جانتا ــــــ
تُو نے صرف میرا حسین چہرا دیکھا ہے لیکن تو نہیں جانتا کہ میں ساری کی ساری
حسین ہوں ــــــ دمیتا ایک نہیں ایسے ہزاروں تعجب تجھے ہر روز ہوں گے
جب ہر بار تجھ پر میرا حسُن ایک نئی چیز کا انکشاف کرے گا۔ آہ! تو مجھ سے کس قدر
والہانہ محبت کرے گا ــــــ میری باہنوں میں فرطِ مسرت سے تو کیسے کانپ
کانپ اٹھے گا ــــــ مجھے یقین نہیں آتا کہ تو نے وہ فضول سی کنگھی لانے سے
انکار کر دیا ہے۔ جب کہ میرے سنہرے بالوں کی ساری لٹیں تیرے شانوں
پر بل کھایا کریں گی ــــــ نہیں ابھی نہیں ــــــ اس وقت تو انہیں ہاتھ
لگانے کا حق دار نہیں ــــــ کل ــــــ کل ــــــ

دمیتا :۔ ہاں کل ــــــ کل تینوں تحفے تیرے قدموں میں ہونگے ــــــ

نبیلا :۔ اور اگر تو میرے لئے موتیوں کی وہ مالا بھی لے آیا جو عشق کی
مورتی کے گلے میں پڑی ہے تو میں تجھے بتاؤں گی کہ میرے ہونٹوں میں اتنے
بوسے ہیں جتنے سات سمندروں میں موتی ــــــ لو اب کل ملیں گے ــــــ

کل .... یعنی دوسرے دن دمیتا صنم تراش کو ایک عورت کے لئے
جس کے حسن نے اسکی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ تین عجیب و غریب تحفے
لے جانا تھے ــــــ مصر کی حسین ترین عورتوں پر راج کرنے والا ایک غلام
بن کے رہ گیا تھا اگر نبیلا اس کے دل و دماغ پر پوری طرح نہ چھا گئی ہوتی تو

بہت ممکن تھا کہ وہ اس عورت کی عجیب و غریب خواہشات کو دریائے نیل کی لہریں سمجھتا جو پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور جھاگ بن کر لوٹ جاتی ہیں۔ مگر وہ بنیلا کے حُسن کی تیز و تند لہروں میں بہہ گیا تھا اور بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سیلاب پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلنے پائے اُسے مصر کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی کی خوابگاہ تک لے گیا اور اس نے وہ کام کیا جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا ــــ کنگھی حاصل کرنے کے لئے اسے کاہن کی بیوی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگنا پڑے۔ جب دیتا نے اس عورت کے سینے میں زہریلی سوئی چبھوئی تو اس کا دل اس مسرت سے دھڑکتا دھڑکتا بند ہو گیا کہ اس کا قاتل مصر کا وہ حسین نوجوان ہے جس کے دیدار کے لئے وہ اپنی سو جانیں بھی قربان کرنے کے لئے تیار تھی ــــ کنگھی حاصل کرنے کے بعد، یعنی پنے عشق کی پہلی خونین منزل طے کر کے دیتا نے بڑی صفائی سے مشہور رقاصہ سارہ کے مکان سے چاندی کا وہ آئینہ چرایا جس میں شعلہ نفس شاعرہ سیفو اپنے روئے نگار دیکھا کرتی تھی ــــ شبہ ایک جواں سال لڑکی پر کیا جس کے شباب کا شعلہ اولیں بھی لپکنے بھی نہ پایا تھا۔ اس دوشیزہ کو اس جرم میں سولی پر چڑھوا دیا گیا ــــ بنیلا کے عشق کو دیتا نے خون کا یہ دوسرا گھونٹ پلایا اور موتیوں کی وہ مالا لینے کے لئے روانہ ہو گیا جو اسکی بنائی ہوئی مورتی کو گلے میں پڑی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے حسن و عشق کی مورتی کے گلے سے جدا کی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے رات کے آسمان کی پیشانی سے تاروں کی ساری افشاں چھین لی ہے۔ دیوتا کی اس بےحرمتی پر اُسے افسوس ہوا مگر بنیلا اُس سے بڑی دیوی تھی ــــ اب تینوں تحفے اس کے پاس تھے اور جب انہیں ساتھ لیکر بنیلا سے ملنے گیا تو اسے یقین تھا کہ

وہ اسے کسی نئے اور کڑے امتحان میں ڈال دیگی ـــــ وہ اس کیلئے تیار تھا

بنیلا :- لے آیا میرے تحفے ـــــ تو لے آیا میرے تحفے ـــ مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ کبھی نہ ملنے آئے گا۔

دیتیا :- اس لئے کہ تیرے حکم کی تعمیل لازم تھی

بنیلا :- آہ دیتیا میرے پیارے دیتیا تو کتنا اچھا ہے ـــــ جو کچھ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا ـــــ مقدس دیوتاؤں کی قسم مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ محبت کیا ہے ـــــ پیارے اب میں تجھے اس سے کہیں زیادہ دونگی جس کا میں نے تجھ سے کل وعدہ کیا تھا ـــــ وہ عورت جو سمندر میں بھٹوس چٹان کی مانند کھڑی تھی آج پاش پاش ہو گئی ہے۔

بوڑھے آسمان نے شاید ہی ایسا انقلاب دیکھا ہو ـــــ تو یہ سمجھا ہوگا کہ میں تجھ سے صرف محبت کرونگی ـــــ نہیں آج میں اپنے حسن کی تمام خوبیاں تیری نذر کرتی ہوں اپنی ساری معصومیت تیری بھینٹ چڑھاتی ہوں۔ اپنی کنواری روح کی تمام کپکپاہٹیں تیرے حوالے کرتی ہوں ـــــ آ ـــــ اب یہ شہر چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لئے کہیں بھاگ جائیں۔ کسی ایسی جگہ جا رہیں جہاں تیرے میرے سوا اور کوئی نہ ہو ـــــ کوئی نہ ہو ـــــ جہاں ہم ایسے دن گزاریں جن پر سہاگ کی راتیں رشک کریں۔ عشق و محبت کی تاریخ میں شاید ہی ایسے کارنامے کا ذکر ہو جو کہ تو نے میرے لئے سرانجام دیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس روئے زمین پر مجھ ایسی والہانہ محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہو گی ـــــ پر تیرے ہونٹوں پر

یہ مہر خاموشی کیوں لگی ہے ـــــ تو بولتا کیوں نہیں۔

دمیتیا :۔ میں کیا بولوں ـــــ حیرت مجھے نہ جانے کہاں بہالے گئی ہے ـــ
میں سمجھتا تھا آسمان بہت اونچا ہے پر اس وقت وہ مجھے زمین پر لیٹا
دکھائی دے رہا ہے۔

نبیلا :۔ یہ تو نے کیا کہا ـــــ یہ تو نے کیا کہا۔

دمیتیا :۔ میں کہتا ہوں الوداع ـــــ الوداع۔

نبیلا :۔ الوداع ـــــ یہ میں کیا سن رہی ہوں دمیتیا ـــــ یہ تین تحفے
تو نے اتنی مشکلوں سے صرف اس لئے حاصل کئے تھے کہ مجھے اور میری
محبت کو الوداع کہہ دے۔

دمیتیا :۔ مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا سو میں نے کر دیا۔

نبیلا :۔ میں سمجھی نہیں۔

دمیتیا :۔ تو سمجھے یا نہ سمجھے مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں
یہ چھوٹا سا اسرار، یہ ننھی سی گتھی اب تیرے ناخن تدبیر کے لئے چھوڑ رہا ہوں
ـــــ الوداع۔

نبیلا :۔ دمیتا ـــــ دمیتا ـــــ یہ میں کیا سن رہی ہوں ـــــ یہ لہجہ
کہاں سے پیدا ہو گیا ـــــ کیا سچ مچ یہ لفظ تیری زبان سے نکلے ہیں
ـــــ مجھے کچھ تو بتا ـــــ آخر ہوا کیا۔

دمیتیا :۔ کیا میں ایک ہی بات ہزار بار دہراؤں۔ تیرے ہی لئے ہاتھی دانت
کی کنگھی لانے کے لئے میں نے کاہن کی بیوی کو قتل کیا۔ تیرے ہی لئے

میں نے سارہ کے یہاں سے آئینہ چرایا اور اصل مجرم کے بجائے ایک معصوم دوشیزہ پھانسی پر چڑھادی گئی۔ تیرے ہی لئے میں نے حسن و عشق کی مورتی کے گلے سے موتیوں کا ست لڑا ہار اتارا۔ یہ تین تحفے مجھے تیرے حضور میں حاضر کرنے تھے جن کے عوض میں تیری طرف سے مجھے صرف ایک چیز ملنی تھی —— تیری التفات —— اس وقت میں نے یہ سودا بہت مہنگے داموں پر قبول کر لیا۔ لیکن اب مجھے اس جنس کی قدر و قیمت معلوم ہو گئی ہے جسے میں خرید رہا تھا —— اب میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا —— تو بھی ٹھیک اسی طرح مجھ سے کچھ طلب نہ کر اور چپ چاپ چلی جا —— مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسی سیدھی سادی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔

نبیلا:۔ اگر یہی بات ہے تو یہ تحفے اپنے پاس رکھ —— کیا تو سمجھتا ہے کہ مجھے انکی ضرورت ہے —— نہیں میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں —— صرف تجھے ——

دتیا:۔ مجھے معلوم ہے —— مگر میں اب تجھے نہیں چاہتا اور چونکہ ایسے معاملوں میں طرفین کی رضامندی ضرور ہوتی ہے اسلئے ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔۔۔ میں نے کھلے الفاظ میں تجھے سمجھانے کی انتہائی کوشش کی ہے مگر افسوس ہے کہ میں اپنے دل کی بات تجھ پر واضح نہیں کر سکا در اصل مجھ میں اتنی قدرت بھی نہیں ہے کہ تجھے اچھی طرح سمجھا سکوں اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ تو اس حقیقت کو جیسی بھی وہ ہے قبول کر لے —— تو یہ راکھ کریدنا چاہتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ راکھ نہیں ہو سکتی ایسی حالت میں ہماری گفتگو سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

نبیلا:۔ میری طرف سے لوگوں نے یقیناً تیرے کان بھرے ہیں۔

دتیا:۔ تیرے شکوک بے بنیاد ہیں۔

بنیلا:۔ نہیں نہیں۔ میں سب جانتی ہوں ـــــ مجھے سب کچھ معلوم ہے لوگوں نے ضرور میرے بارے میں زہر اُگلا ہے ـــــ انکار نہ کر ـــــ وادیٔ نیل میں اتنے ذرے نہیں جتنے کہ میرے دشمن ہیں ـــــ میرے خلاف یقیناً تجھ سے کہا گیا ہے لیکن دتیا، تجھے ان کی زہریلی باتیں ہرگز نہیں سننا چاہیے تھیں۔ مقدس یوتادکی قسم جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے سفید جھوٹ ہے۔

دتیا:۔ مجھ سے تیرے خلاف کسی نے کچھ نہیں کہا۔

بنیلا:۔ دتیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ میں تجھے دھوکا دے ہی نہیں سکتی اس لئے کہ میں تجھ سے سوائے تیرے اور کسی چیز کی طالب نہیں تو پہلا آدمی ہے جس سے میں نے ان الفاظ میں گفتگو کی ہے۔

دتیا:۔ ایسی باتوں کا وقت گذر چکا ہے ـــــ ایک بار تو میری ہو چکی ہے ـــــ ایک دفعہ میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں۔

بنیلا:۔ کب، کہاں، کیسے؟ ـــــ یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

دتیا:۔ میں سچ کہتا ہوں ـــــ تجھے اپنائے بغیر میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں تجھ سے جو کچھ میں چاہتا تھا غیر ارادی پر تو نے مجھے دے دیا ہے ـــــ تو مجھے خوابوں کی دنیا میں لے گئی۔ میں مانتا ہوں پر اب اس دنیا میں واپس جاکر اس حسن اور خوبصورتی کا نظارہ کرنے کی مجھ میں تاب نہیں، اور نہ تو مجھے اس دنیا میں پھر لیجا سکتی ہے ـــــ ایک راستے پر مسرت اور شادمانی سے دو مرتبہ ملاقات نہیں ہوا کرتی ـــــ ہم ایک سڑک پر مخالف سمتوں سے آرہے تھے تھوڑی دیر ہمارے قدم رکے مگر اب ہمیں جدا ہو جانا چاہیے ـــــ تیرا راستہ

اِدھر ہے اور میرا اُدھر۔

نبیلا:۔ صرف ایک ہی نظارے سے تیری نگاہیں سیر ہوگئیں ـــــ ایک ہی بار خوابوں کی دنیا میں جاکر تیرا جی بھر گیا ـــــ پھولوں بھرے باغ میں جاکر تو ایک ہی کلی پر قناعت کر گیا۔

دمیتا:۔ تو اصلیت کے قریب پہونچ گئی ہے ـــــ میں ایک ہی نظارے خوابوں کی دنیا کی ایک ہی سیر اور پھولوں بھرے باغ کی ایک ہی کلی پر قانع رہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ میں اس نظارے کے حسین تخیل، اس سیر کی مسرت بخش یاد اور اس کلی کی پیاری مہک کو اپنے دل و دماغ میں قائم رکھنا چاہتا ہوں ـــــ میں نے تیری تصویر کو جس سنہرے فریم میں دیکھا ہے اُسے بدلنے کی کوشش نہ کر۔

نبیلا:۔ اور میرے ـــــ میرے متعلق تو کیا کہتا ہے جو اتنی بھیانک باتیں سننے پر بھی تجھ سے محبت کرتی ہے ـــــ کیا میں نے وہ خواب دیکھا ہے جس کا ذکر تو بار بار کرتا ہے اور کیا میں اس مسرت اور شادمانی کی گھڑیوں میں تیری شریک رہی ہوں جو تو نے مجھ سے چرائی ہیں ـــــ ہاں چرائی ہیں ـــــ

دمیتا:۔ کیا اس وقت تجھے میرا خیال تھا جب میری کمزوری سے فائدہ اٹھاکر تو نے مجھ سے تین شرمناک فعل کرائے ـــــ تین شرمناک فعل جو ساری زندگی مجھے تین مہیب دیو بن کر ڈراتے رہیں گے ـــــ صرف ایک لمحہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر تو نے مجھ سے تین احکام منوائے جو میری زندگی کو پاش پاش کر سکتے تھے۔

نبیلا:۔ میں نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تو میرا ہو جائے ـــــ سارے کا سارا میرا

—— تیری ہو کر میں تجھے اپنا کبھی نہ بنا سکتی۔

دمیتیا:۔ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ لیکن صرف چند لمحات کے لئے ——
تو نے مجھے اپنا غلام بنانا چاہا۔ پر اب میں تیری غلامی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں

بلیلا:۔ دمتیا تو کسی کا غلام نہیں۔ میں تیری کنیز ہوں۔

دمتیا:۔ ہم میں سے وہی دوسرے کا غلام ہے جو کہ محبت کرتا ہے.... غلامی....
یہ عشق کا دوسرا نام ہے.... تم سب عورتوں کے دل و دماغ میں ایک ہی خواہش
ہوتی ہے کہ تمہاری کمزوری مرد کی طاقت پاش پاش کر دے اور تمہاری
بے شعوری اسکی ذکاوت پر حکومت کرے۔ تم محبت کرنا یا محبت کئے جانا پسند
نہیں کرتیں —— شباب کی آمد کے ساتھ ہی یہ خواہش تمہارے سینے میں
کروٹیں لینے لگتی ہے کہ تم کسی مرد کو غلام بناؤ۔ اس کو ذلیل کرو اور سر جھکا کر
اس پر اپنے چپل رکھ دو۔ پھر تم ہم لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق تلوار،
تیشہ، قلم اور ہر وہ چیز جو تم پر قادر ہے چھین سکتی ہو، توڑ سکتی ہو —— اس وقت
تم چاہو تو ہرکیولس پہلوان سے گر زلے کر اس کے ہاتھ میں چرخہ دیدو ——
لیکن تم کسی مرد کی گردن جھکانے میں ناکام رہتی ہو تو ان ہاتھوں کو اچھا
سمجھتی ہو۔ جو تمہارے گورے بدن پر نیل ڈال دیں۔ اس مرد کو دیوانہ وار چاہتی
ہو جس کا سخت گھٹنا تمہاری گردن دباتا ہے —— حتیٰ کہ اس مرد سے بھی التفات
کرتی ہو جو ہر روز تمہاری توہین کرے۔ وہ مرد جو تمہارے پاؤں چومنے
سے انکار کر دے تو تم اسے سر پر بٹھا لو گی —— وہ مرد جسکی آنکھیں تمہاری
رخصت پر نمناک نہیں ہوتیں تمہاری چٹیا پکڑ کر جہاں چاہے تمہیں لیجا سکتا ہے

محبت زدہ عورت چونکہ تو غلام نہیں بنا سکی اس لئے تجھے غلامی قبول کرنا ہوگی۔

نیلا:۔ دیتیا۔ تو مجھے مار، پیٹ، میرا بدن نیلوں سے بھر دے مگر اس کے بعد مجھ سے محبت ضرور کر۔

دیتیا:۔ نہیں اب مجھے تجھ سے نفرت ہے۔

نیلا:۔ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تیری روح کے اندر میں سما چکی ہوں تو صرف ایک عورت کے سامنے جھکنے سے شرماتا ہے لیکن پیارے اگر صرف اتنی سی بات تیرے وقار کی تسکین کیلئے کافی ہے تو مجھے تیری غلامی قبول ہے۔ تجھے حاصل کرنے کیلئے میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں اس سے کہیں زیادہ جو تو نے اب تک مجھے دیا ہے.... بول میں تیرے لئے کیا قربانی کر سکتی ہوں ایک بار تجھے اپنا بنا کر مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔

دیتیا:۔ کیا تو قسم کھاتی ہے۔

نیلا:۔ حسن و عشق کی دیوی کی قسم میں تیرے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں

دیتیا:۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔

نیلا:۔ دیر نہ کر جلدی بول۔ تو مجھ سے کیسی قربانی چاہتا ہے۔

دیتیا:۔ بالکل معمولی۔ میں تجھ سے تیری طرح تین تحفے نہیں مانگتا۔ اس لئے کہ یہ رواج کے خلاف ہوگا۔۔۔۔ لیکن میں تجھے تحفے قبول کرنے کے لئے ضرور کہہ سکتا ہوں کیا نہیں۔

نیلا: کیوں نہیں۔

دیتیا:۔ یہ آئینہ کنگھی اور ہار منگاتے وقت کیا تجھے انکو استعمال کرنیکا خیال تھا

اس چوری کے آئینے، اس خون آلود کنگھی اور اس مقدس ہار کو ـــــ
یہ ایسے جواہرات نہیں ہیں کہ ان کی عام نمائش کی جائے .....''

نبیلا :- بہت دور کی سوجھی

دمتیا :- پہلے میرا ایسا خیال نہیں تھا۔ مگر اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے محض ظلم ڈھانے کی خاطر مجھ سے تین جرم کرائے۔ تین جرم جن سے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے اب تجھے ان تحفوں کی عام نمائش کرنی ہوگی ـــــ آئینہ ہاتھ میں لے کر کنگھی بالوں میں سجا کر اور ہار گلے میں پہن کر تو باغ میں سیر کے لئے جائے گی۔ لوگ تجھے دیکھیں گے اور فوراً ہی ملکہ کے سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے ـــــ لیکن تجھے وہ چیز مل جائے گی جس کی تجھے خواہش تھی اور میں سورج طلوع ہونے سے پہلے زنداں میں تیری ملاقات کے لئے آؤں گا ـــــ الوداع۔

جس طرح دمتیا اپنے وعدے پر قائم رہا اسی طرح نبیلا نے اپنا قول پورا کیا، چنانچہ اسی روز شام کو جب کہ سورج کی کرنیں دریائے نیل کی لہروں کو چوم رہی تھیں، نبیلا اٹھی اور اپنی بڑی خادمہ کو حکم دیا کہ وہ اُسے اچھی طرح سے سجائے سج سجا کر اس نے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی جمائی گلے میں ست لڑا ہار پہنا اور ہاتھ میں آئینہ لے کر باغ عامہ کی سیر کو چل دی۔

لوگوں نے وہ تین چیزیں دیکھیں جن کے گم ہو جانے پر سارے مصر میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور حیرت میں غرق ہو گئے۔ بعض عورتیں اس نظارے کی تاب نہ لا سکیں۔ اور نبیلا کے خوفناک انجام نے ان پر کپکپی طاری کر دی ـــــ مگر

بنیلا کے قدم پہلے سے زیادہ مضبوط تھے۔ باغ کی پتھریلی روشوں پر چلتے ہوئے وہ سنگ مرمر کا ایک حسین مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

فوراً ہی آگ کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ حسن و عشق کی مقدس دیوی کا ست لڑا ہار، سارہ کا آئینہ جس میں سیفو اپنا چہرہ دیکھا کرتی تھی اور کاہن کی بیوی کی کنگھی بنیلا رقاصہ کے پاس ہے۔ چنانچہ بنیلا ابھی باغ کی تیسری روش ہی پر چل رہی تھی کہ ملکۂ مصر کے سپاہیوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور زندان میں قید کر دیا

ساری رات وہ اس اندھیرے زندان میں طرح طرح کے ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ بار بار وہ کسی وحشتناک خیال سے کانپ اٹھتی۔

اس ادھیڑبن میں صبح ہو گئی اور حسب وعدہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ دتیا زندان میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے جلاد جس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھا بیشتر اس کے کہ بنیلا دتیا سے کچھ کہے زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

محبت کا یہ آخری جام اس نے ہونٹوں سے لگایا اور سارا زہر غٹا غٹ پی گئی۔

زہر پینے کے بعد اس نے کنکھیوں سے دتیا کی طرف دیکھا گویا وہ اس سے یہ کہنا چاہتی ہے "دیکھ موت کا بوسہ یوں لیا کرتے ہیں" مگر دتیا نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اُس کے پاؤں دبا کر جلاد نے پوچھا "کیا تجھے کچھ محسوس ہوا؟"

"بنیلا نے جواب دیا نہیں!"

پھر جلاد نے اس کے گھٹنے دبائے۔ "اب"

بیشتر اس کے کہ نبیلا جواب دے وہ لڑکھڑا کر چوبی تخت پر گر پڑی دنیا سے آخری بار کچھ کہنے کے لئے اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر زہر اپنا کام کر چکا تھا ـــــ آخری بات اس کی زبان پر موت کی سردی نے منجمد کر دی اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا کی تاریکی میں سو گئی۔

کہتے ہیں نبیلا کی لاش کو سامنے رکھ کر دتیا سنگ تراش نے مردہ حسن سے زندہ حسن پیدا کیا ـــــ اس نے مصر کی اس حسین و جمیل رقاصہ کی تمام رعنائیاں پوشیدہ اور ظاہر ـــــ سنگ مرمر کے ایک بت میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیں۔

نبیلا کا مجسمہ جب تیار ہو گیا تو لوگوں نے اس کی زبان سے یہ لفظ سنے "یہ عورت اب مجھ سے اور اپنے آپ سے کہیں زیادہ دیر تک زندہ رہے گی۔

(ماخوذ)

مسنز ڈی سِلوا

بالکل آمنے سامنے فلیٹ تھے۔ ہمارے فلیٹ کا نمبر تیرہ تھا۔ اس کے فلیٹ کا چودہ۔ کبھی کوئی سامنے کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو مجھے یہی معلوم ہوتا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہو رہی ہے اسی غلط فہمی میں جب میں نے ایک بار دروازہ کھولا تو اُس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

یوں تو اس سے پہلے کئی دفعہ میں اُسے سیڑھیوں میں، بازار میں اور بالکونی دیکھ چکی تھی مگر کبھی بات کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی۔ "تم نے سمجھا کوئی تمہارے گھر آیا ہے۔" میں بھی جواب میں مسکرا دی۔ چند لمحات تک وہ اپنے دروازے کی دہلیز میں اور میں اپنے دروازہ کی دہلیز میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہو گئی۔

اس کا نام میری تھا۔ خدا معلوم کیا تھا۔ مگر اس کے خاوند کا نام پی۔ این ڈِسلوا تھا چنانچہ میں اسے مسز ڈی سلوا ہی کہتی تھی۔ میں اسے میری ضرور کہتی مگر وہ عمر میں مجھ سے

کہیں بڑی تھی۔ موٹے موٹے نقش، چھوٹی گردن، اندر دھنسی ہوئی ناک پکوڑا سی، سر چھوٹا جس پر کٹے ہوئے بال ہمیشہ پریشان رہتے تھے آنکھیں دوات کے منہ کی طرح کھلی رہتی تھیں معلوم نہیں سوتے میں انکی شکل کیسی ہوتی ہوگی؟

اس کا خاوند معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ کسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ جب شام کو گھر لوٹتا اور مجھے باہر بالکنی میں دیکھتا تو اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار کر مجھے سلام ضرور کرتا بے حد شریف آدمی تھا۔ مسز ڈی سلوا بھی بہت ملنسار اور باخلاق عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی پُرسکون زندگی بسر کرتے تھے۔

چار پانچ برس کا ایک لڑکا تھا اس کو دیکھ کر کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باپ چھوٹا ہو گیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں سکڑ گئی ہے ماں باپ دونوں کے نقش کچھ اس طرح اس بچے میں خلط ملط ہو گئے تھے کہ آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ماں پر ہے یا باپ پر۔

پانچ برس میں اُن کے یہاں صرف یہی ایک بچہ ہوا تھا۔ مسز ڈی سلوا نے ایک روز مجھ سے کہا تھا "ہمارا ماں بھی اس موافق بچہ دیا کرتا تھا۔۔۔۔ پانچ برس کے پیچھے ایک پہلے ہم ہوا۔ پانچ برس کے پیچھے ہمارا بھائی ہوا ــــ اس کے پیچھے ہمارا ایک اور بہن۔"

پانچ برس کی قید چونکہ پوری ہو چکی تھی اس لئے مسز ڈی سلوا اب پیٹ سے تھی اس کا خاوند بہت خوش تھا۔ مجھے مسز ڈی سلوا نے بتایا کہ اپنی ڈائری میں اس نے کئی تاریخیں لکھ رکھی ہیں۔ پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ۔ ہونے والے بچے کی پیدائش کی تاریخ کا اندازہ اور وہ سال جس میں کہ تیسرا بچہ پیدا ہوگا۔۔۔۔ یہ سارا

حساب اس نے اپنی ڈائری میں درج کر رکھا تھا۔ مسز ڈی سلوا کہتی تھی کہ اس کے خاوند کو پانچ برس کی یہ قید اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد وہ پانچ برس کے لئے کیوں چھٹی پر چلی جاتی ہے۔ مسز ڈی سلوا خود حیران تھی مگر اسے فخر سمجھتی تھی کہ وہ اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

میں بھی کم متحیر نہ تھی، سوچتی تھی یا الٰہی یہ پانچ برسوں کا چکر کیا ہے کیوں ان دونوں میں سے ایک گنتی نہیں بھول جاتا؟...... قدرت نے کیا اس عورت کے اندر ایسی مشین لگا دی ہے کہ جب پانچ سال کے پانچ چکر ختم ہو جاتے ہیں تو کھٹ سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ہمارے پڑوس میں ایک اور عورت تھی جو ڈیڑھ برس سے پیٹ سے تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اس کے رحم میں کوئی خرابی ہے بچہ موجود ہے جو پیدا ہو جائے گا مگر اس کی نشوونما تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد چونکہ رک جاتی ہے اس لئے ابھی تک اتنا بڑا نہیں ہوا کہ پیدا ہو سکے۔

امی جان جب مجھ سے یہ باتیں سنتی تھیں تو کہا کرتی تھیں قیامت آنیوالی ہے خدا جانے دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے کبھی ایسی باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں۔ عورتیں چپ چاپ نو مہینے کے بعد بچے جن دیا کرتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب کسی کے بچہ پیدا ہونے والا ہو تو سارے شہر کو خبر ہو جاتی ہے مٹکا سا پیٹ لئے باہر جا رہی ہیں۔ سڑکوں پر گھوم رہی ہیں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں مگر کیا مجال کہ ان کو ذرا سی بھی حیا آ جائے...... آج کل تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے

میں یہ سنتی تھی تو دل ہی دل میں ہنستی تھی۔ امی جان کا پیٹ بھی کئی بار پھول کر مٹکا بن چکا تھا اور یہ مٹکا لئے وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں ہر دو بار کیٹے

جاتی تھیں مگر جب دوسروں کو دیکھتی تھیں یا ان کے متعلق باتیں سنتی تھیں تو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتی تھیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا انہیں فوراً نظر آجاتا تھا۔

آدمی اگر اس مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا اُسے باہر آنا جانا بالکل بند کر دینا چاہیے۔ مٹکا سا پیٹ لئے بس گھر میں بیٹھے رہو۔ صوفے پر سے اُٹھو چارپائی پر لیٹ جاؤ چارپائی سے اُٹھو تو کسی کرسی پر لیٹ جاؤ۔ مگر آفت تو یہ ہے کہ مٹکا سا پیٹ لئے بیٹھنے اور لیٹنے میں بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آدمی چلے پھرے، تاکہ بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ یہ کیا کہ پیٹ میں بڑی سی فٹ بال ڈالے گھر کی چار دیواری میں قید رہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امّی جان حیا کیوں طاری کرنا چاہتی ہیں۔ بھئی اگر کوئی پیٹ سے ہے تو کیا اس کا قصور ہے؟ اس نے کوئی شرمناک بات کی ہے جو وہ شرم محسوس کرے۔

جب خدا کی طرف سے یہ مصیبت عورتوں پر عاید کر دی گئی ہے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک بچے کو پیٹ میں رکھیں تو اس میں شرمانے اور لجانے کی بات ہی کیا ہے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب کام چھوڑ کر آدمی بالکل نکما ہو جائے اس لئے کہ اُسے بچہ پیدا کرنا ہے۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے، اب کیا اس کے لئے باہر آنا جانا موقوف کر دیا جائے لوگ ہنستے ہیں تو ہنسیں، کیا ان کے گھر میں ان کی مائیں اور بہنیں کبھی پیٹ سے نہیں ہونگی۔ بھئی، مجھے تو امّی جان کی یہ منطق بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے اصل میں انکی عادت یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہر بات پر اپنا لکچر شروع کر دیتی ہیں خواہ کسی کو بُرا لگے یا اچھا۔ اپنی لڑکی کی بات ہو تو کبھی کچھ نہ کہیں گی۔ پچھلی دفعہ جب عارف میرے پیٹ میں تھا اور میں ہر دوسرے تیسرے روز کو جاتی تھی تو قسم لے لو جوان کے منہ سے

میرے خلاف کچھ نکلا ہو، پر اب چونکہ بات مسز ڈی سلوا کی تھی جو بیچاری صرف اتوار کی صبح گرجا میں نماز پڑھنے اور شام کو سودا سلف لانے کے لئے اپنے خاوند کے ساتھ باہر نکلتی تھی اس لئے امّی جان کو "تو یہ ہے بیوی، تو یہ ہے بیوی" کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

پہلے بچے پر پیٹ زیادہ نہیں پھولتا لیکن دوسرے بچے کو چونکہ پھیلنے کے لئے زیادہ جگہ مل جاتی ہے اس لئے پیٹ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔

مسز ڈی سلوا لمبا سا جغہ پہنے جب گھر میں چلتی پھرتی تھی تو اس کا پیٹ بہت بدنما معلوم ہوتا تھا۔ قد اس کا چھوٹا تھا۔ پنڈلیاں جو بہت پتلی تھیں اور جغے کے نیچے آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں۔ بہت ہی بھدّی تصویر پیش کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھڑونچی پر مٹکا رکھا ہے سارا دن اس لمبے جغے میں وہ کارٹون بنی رہتی تھی۔

شروع شروع میں بیچاری کی بہت بُری حالت ہوئی تھی۔ ہر وقت تلے اُوپر۔ ملتی۔ قلفی والے کی آواز سنتی تو تڑپ جاتی اس کو بلاتی لیکن جب کھانے لگتی تو فوراً ہی جی مالش کرنے لگتا۔ سارے دن لیمو چوستی رہتی۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں اس کے یہاں گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بستر پر لیٹی لیکن ٹانگیں اوپر اٹھا رکھی ہیں میں نے مسکرا کر کہا "مسز ڈی سلوا اکسر سائز کر رہی ہو کیا؟"

جھنجھلا کر بولی "ہم بہت تنگ آگیا ہے۔ یوں ٹانگیں اوپر کرتا ہے تو ہمارا طبیعت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

ٹھنڈی ٹھنڈی دیوار کے ساتھ پیر لگانے سے اُسے کچھ تسکین ہوتی تھی بعض اوقات اُسکی طبیعت گھبراتی تھی تو زور زور سے میز کو یا بستر کو جہاں بھی وہ بیٹھی ہو

ٹکریں مارنا شروع کر دیتی تھی۔ اور جب اس طرح گھبراہٹ کم نہیں ہوتی تھی تو تنگ آکر رونا شروع کر دیتی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آتی تھی۔ چنانچہ وہ تمام تکلیفیں جو مجھ پر بیت چکی تھیں بھول کر اس سے کہا کرتی تھی "مسز ڈی سلوا جان بوجھ کر تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی۔"

اس پر وہ بگڑ کر کہتی "ہم نے کب لیا۔ پانچ برس کے پیچھے سالا یہ ہونے کو ہی مانگتا تھا۔"

میں کہتی۔ "تو مسز ڈی سلوا پانچویں سال تم بنگلور کیوں نہ چلی گئیں۔"

وہ جواب دیتی "ہم چلا جاتا۔ سچ ہم جانے کو ایک دم تیار تھا پر یہ وار اسٹارٹ ہو گیا۔ ہم وہاں رہتا ہمارا صاحب یہاں رہتا ۔ ۔ ۔ ۔ خرچ بہت ہوتا۔ سو یہ سوچ کر ہم نہ گیا اور سالا یہ آفت سر پر آن پڑا۔"

شروع شروع میں مسز ڈی سلوا کو یہ آفت معلوم ہوتی تھی پر اب وہ خوش تھی کہ دوسرا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ قے اور متلی ختم ہو گئی تھی۔ ٹانگیں اوپر کر کے لیٹنے کی اب ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک رہتی تھی۔ یہ سلسلہ صرف پہلے دو مہینے تک رہا تھا۔

اب اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ایک صرف کبھی کبھی پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہو جاتی تھی یا بچہ جب پیٹ میں پھرتا تھا تو اسے تھوڑے عرصے کیلئے بے چینی سی محسوس ہوتی تھی۔

مسز ڈی سلوا بالکل تیار تھی۔ چھوٹے چھوٹے فراک سی کر اس نے ایک چھوٹے

سے مینے بیگ میں رکھ چھوڑے تھے۔ ننھا لحیف پوتڑے بھی تیار تھے اس کا خاوند لوہے
کا ایک جھولا بھی لے آیا تھا اس کے لئے مسز ڈی سلوا نے پرانے تکیوں کے روئی سے
ایک گدا بھی بنا لیا تھا۔ غرض کہ سب سامان تیار تھا۔ اب مسز ڈی سلوا کو صرف کسی
ہسپتال میں جا کر بچہ جن دینا تھا اور بس۔

مسٹر ڈی سلوا نے دو مہینے پہلے ہسپتال میں اپنی بیوی کے لئے جگہ بک کر رکھی
تھی پانچ روپئے اڈوانس دے دیئے تھے تاکہ عین وقت پر گڑبڑ نہ ہو اور ہسپتال
میں جگہ مل جائے۔ مسٹر ڈی سلوا بہت دور اندیش تھا۔ پہلے بچے کی پیدائش
پر بھی اس کے انتظامات ایسے ہی مکمل تھے۔

مسز ڈی سلوا اپنے خاوند سے بھی کہیں زیادہ دور اندیش تھی جیسا کہ میں
بتا چکی ہوں اس نے ان نو مہینوں کے اندر اندر وہ تمام سامان تیار کر لیا تھا جو
بچے کے پہلے دو برسوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ نیچے بچھانے کے لئے ربڑ کے کپڑے
فیڈر۔ چسنیاں، جھنجھنے اور دوسرے جاپانی کھلونے اور اسی قسم کی اور چیزیں
سب بڑی احتیاط سے اس نے ایک علیحدہ ٹرنک میں بند کر رکھی تھیں۔ ہر دوسرے
تیسرے دن وہ یہ ٹرنک کھول کر بیٹھ جاتی تھی اور ان چیزوں کو اور زیادہ قرینے سے
رکھنے کی کوشش کرتی تھی در اصل وہ دن گنتی تھی کہ جلدی بچہ پیدا ہو اور وہ
اسے گود میں لیکر کھلائے دودھ پلائے۔ لوریاں دے اور جھولے میں لٹا کر سلائے
پانچ برس کی تعطیل کے بعد اب گویا اس کا اسکول کھلنے والا تھا وہ اتنی ہی خوش تھی
جتنا کہ طالب علم ایسے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں۔

ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر کا مطب تھا اس ڈاکٹر کے پاس

مسز ڈی سلوا ہر روز نوکر کے ہاتھ اپنا قارورہ بھیجتی تھی، کہتے ہیں آخری دنوں میں قارورہ دیکھ کر ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ بچہ کب پیدا ہوگا۔ مسز ڈی سلوا کا خیال تھا کہ دن پورے ہو گئے ہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کہتا تھا کہ نہیں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔

ایک روز میں غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ میں نے مسز ڈی سلوا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی، پھر دروازہ کھلا اور مسز ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا اپنے خاوند کا سہارا لیکر اترنے والی تھی۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی بوڑھی عورتوں کا سا انداز اختیار کر کے کہا۔ "ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ۔"

مسٹر ڈی سلوا نے جب میری آواز سنی تو مسکرا کر اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اُتار کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا جو نہی بے بی ہو مجھے ضرور خبر دیجئے گا۔"

وہ مسکراہٹ جو مسٹر ڈی سلوا کے میلے ہونٹوں پر سلام کرتے وقت پیدا ہو چکی تھی، یہ سن کر اور پھیل گئی۔

سارا دن میرا دھیان مسٹر ڈی سلوا ہی میں پڑا رہا۔ کئی بار دروازہ کھول کر دیکھا مگر ہسپتال سے نہ تو نوکر ہی واپس آیا تھا نہ مسز ڈی سلوا کا خاوند، شام ہو گئی۔ خدا جانے یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ دنوں کے لئے باہر جانا تھا جہاں میری بہن رہتی تھی۔ مجھے لینے کے لئے آدمی بھی آ گیا مگر ہسپتال سے کوئی خبر نہ آئی۔

تیسرے روز ناہم سے جب میں واپس آئی تو اپنے گھر جانے کے بجائے میں نے مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا میرے سامنے کھڑی ہے —— موٹا سا پیٹ لئے میں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔ "یہ کیا؟"

وہ مجھے اندر لے گئی اور کہنے لگی۔ "ہم کو درد ہوا تو ہم سمجھا ٹائم پورا ہوا وہاں ہسپتال میں گیا اور جب نرس لوگ نے بیڈ پر لٹایا تو درد ایکدم غائب ہوگیا.... ہم بڑا حیران ہوا۔ نرس لوگ تو بڑا ہنسا بولا۔ اتنا جلدی تم یہاں کیوں آگیا۔ ابھی کچھ دن گھر پر اور ٹھیرو۔ پیچھے آؤ..... ہم کو بہت شرم آیا۔"

اس کا یہ بیان سن کر میں بہت ہنسی وہ بھی ہنسی۔ دیر تک ہم دونوں ہنستے رہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنایا کہ کس طرح ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ہسپتال گئی۔ وہاں ایک کمرے میں اسکے تمام کپڑے اتار دیے گئے۔ نام وغیرہ درج کیا گیا اور ایک بستر پر لٹا کر اُسے نرسیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں سے کئی دفعہ اُسے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اس بستر پر وہ چار پانچ گھنٹے تک پڑی رہی اس دوران میں پہلے ایک نرس آئی اس نے اسے نہانے کو کہا نہانے سے فارغ ہوئی تو ایک نرس آئی اس نے اسے انیما دیا۔ انیما دینے کے بعد تیسری نرس آئی جو اس کے انجکشن لگائی گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر آئی اس نے پیٹ ویٹ دیکھا تو جھنجھلا کر کہا۔ "تم کیوں اتنی جلدی یہاں آگیا ہے۔ ابھی گھر جاکر آرام کرو۔" سب نرسیں ہنسنے لگیں۔ وہ پانی پانی ہوگئی۔ کپڑے ویڑے پہن کر باہر نکل آئی جہاں اس کا خاوند کھڑا تھا۔

دونوں کو چونکہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مسز ڈی سلوا نے اس دن کی چھٹی لے رکھی تھی اس لئے وہ رنگل سینما میں مٹینی شو دیکھنے کے لئے چلے گئے۔

مسز ڈی سلوا کو سخت حیرت تھی کہ یہ ہوا کیا۔ پچھلی دفعہ جب اس کے بچّہ ہونے والا تھا تو وہ عین موقع پر ہسپتال پہنچی تھی۔ اب اس کا اندازہ غلط کیوں نکلا۔ درد ضرور ہوا تھا اور یہ بالکل ویسا ہی تھا جو اُسے پہلے بچے کی پیدائش سے تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا پھر یہ گڑبڑ کیوں ہو گئی؟

چھٹے روز شام کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب میں بالکنی میں بیٹھی تھی کہ مسز ڈی سلوا کا نوکر آیا۔ دس روپیے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا کہنے لگا "میم صاحب نے چھُٹا مانگا ہے۔ وہ ہسپتال جا رہی ہیں۔ میں نے جھٹ پٹ دس روپے کی ریزگاری نکالی اور بھاگی بھاگی وہاں گئی۔ میاں بیوی دونوں تیار تھے۔ مسز ڈی سلوا کا رنگ ہلدی کیطرح زرد تھا۔ درد کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور اس کے خاوند نے سہارا دیکر اُسے نیچے آتارا اور ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ "ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ۔" کہہ کر میں اوپر گئی اور انتظار کرنے لگی۔

رات کے بارہ بجے تک میں سیڑھیوں کی طرف کان لگائے بیٹھی رہی مگر ہسپتال سے کوئی واپس نہ آیا۔ تھک ہار کر سو گئی۔ صبح اُٹھی تو دھوبی آگیا اس سے پندرہ دھلائیوں کا حساب کرنے میں کچھ ایسی مشغول ہوئی کہ مسز ڈی سلوا کا دھیان ہی نہ رہا۔

دھوبی میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر باہر نکلا میں دروازے کے سامنے بیٹھی تھی اُس نے باہر نکل کر مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھُلا

کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا کھڑی ہے مٹکا سا پیٹ لئے۔

میں نے قریب قریب چیخ کر پوچھا۔ مسز ڈی سلوا۔۔۔۔ پھر واپس آ گئیں۔"

میں جب اس کے پاس گئی تو وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ گہرے سانولے رنگ کے باوجود سرخ ہو رہا تھا۔ رک رک کر اس نے مجھ سے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ درد بالکل پہلے کے موافق ہوتا ہے پر وہاں نرس لوگ کہتا ہے کہ جاؤ گھر جاؤ ابھی دیر ہے۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بیچاری کی حالت قابل رحم تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرتبہ نرسوں نے اسے بہت بری طرح جھڑکا تھا۔ حیرت، شرم اور بوکھلاہٹ نے مل جل کر اس کو اس قدر قابل رحم بنا دیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ تھوڑے عرصہ کے لئے انتہائی ہمدردی ہو گئی۔ میں دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس کو سمجھایا کہ اس میں شرم کی بات ہی کیا ہے۔ جب بچہ ہونے والا ہو تو ایسی غلط فہمیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ نرسوں کا کام ہے بچے جنانا۔ اُن کے پاس آدمی اسی لئے جاتا ہے کہ آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ انہیں مذاق اڑانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور جب فیس وغیرہ دی جائے گی اور اڈوانس دے دیا گیا ہے تو پھر وہ بے کار باتیں کیوں بناتی ہیں۔

مسز ڈی سلوا کی پریشانی کم نہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اس کا خاوند دفتر سے دو دفعہ چھٹی لے چکا تھا۔ بڑے صاحب سے لیکر چپراسی تک سب کو معلوم تھا کہ بچہ ہونے والا ہے۔ اب وہ منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی طرح محلے میں سب کو معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا دو بار ہسپتال جا کر واپس آ چکی ہے۔ کئی عورتیں اس کے

پاس آچکی تھیں اور ان سب کو فرداً فرداً اُسے بتانا پڑا تھا کہ بچہ ابھی تک پیدا کیوں نہیں ہوا۔ ہر ایک سے اُس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ایک پکی کرسچین عورت تھی، جھوٹ بولنے پر اُسے سخت روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی

ساتویں روز جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر لیٹ کر قریب قریب سو چکی تھی۔ دفعتاً میرے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔ یہ کیا؟...... دوڑ کر میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے فلیٹ سے مسز ڈی سلوا کا نوکر گھبرایا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ کہنے لگا میم صاحب، بے بی...... میم صاحب بے بی...... میں نے اندر جا کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا نیم مدہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ بے چاری نے اب فرید ندامت کے خوف سے وہیں بچہ جن دیا تھا۔

تحفہ

افراد
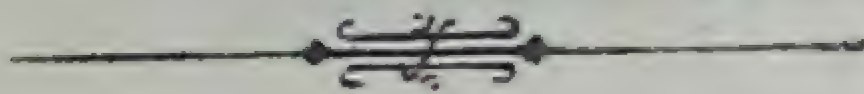
جگل ...... (آواز میں بے نیازی ہو) — شیلا ...... (خوش آواز لڑکی)
گنیش (تعلیم یافتہ بنیا۔ بولنے کا چچا تلا انداز) — ایک لڑکی (شیلا کی سہیلی)
دکاندار (ان پڑھ بنیا۔ جھگڑالو قسم کا آدمی) — رامو (نوکر)

(کالج کا گھنٹہ بجتا ہے ——— ساتھ ہی کئی قدموں کی آواز)

شیلا :۔ جگل ——— جگل

جگل :۔ اوہ ——— شیلا

شیلا :۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔

جگل :۔ کہو

شیلا :۔ میں نے بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہونچی ہوں کہ ہمارا آپس میں ملنا ٹھیک نہیں۔

کالج میں یا کالج کے باہر اب ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہئے۔

جگل :۔ کیوں ؟

شیلا :۔ اس لئے کہ

جگل :۔ کہو کہو صاف صاف کہو

شیلا :۔ اس لئے کہ لوگ تمہیں اول درجے کا بدمعاش۔ آوارہ گرد۔ اور لچّا خیال کرتے ہیں۔

جگل :۔ (ہنستا ہے) صرف خیال ہی کرتے ہیں...... انہیں اب تک یقین ہو جانا چاہئے تھا۔

شیلا :۔ جگل تم کبھی سنجیدہ ہونا بھی سیکھو گے یا نہیں۔

جگل :۔ نہیں۔

شیلا :۔ کیوں۔

جگل :۔ سنجیدگی میں کیا دھرا ہے...... یعنی خواہ مخواہ آدمی سنجیدہ ہوتا پھرے۔ میں صحت مند ہوں اور صحت مند رہتا ہوں۔ اپنی زندگی کو یہ روگ نہیں لگانا چاہتا۔

شیلا :۔ تم نے میرا فیصلہ سن لیا۔

جگل :۔ سن لیا۔

شیلا :۔ تمہیں قبول ہے۔؟

جگل :۔ میں دوسروں کے فیصلے قبول نہیں کرتا ——— میں تم سے ملوں گا اور ملتا رہونگا۔

شیلا :- زندگی اجیرن کر دو گے میری

جگل :- (مسکرا کر) میں تمہیں اپنی زندگی دے دونگا۔

شیلا :- (ازراہ مذاق) جو تمہارے اس بوٹ کی طرح گھسی ہوئی ہے۔

جگل :- استعمال جو زیادہ کرتا رہا ہوں مگر صرف اس کا تلا ہی گھسا ہے۔اوپر کا حصہ بالکل ٹھیک ہے ـــــ پالش کروگی تو چمک اُٹھے گا۔

شیلا :- تم خود پالش کیوں نہیں کرتے ؟

جگل :- اس لئے کہ ......

شیلا :- ٹھیرو ـــــ میں اس وقت سنجیدہ ہونا چاہتی ہوں ـــــ بتاؤ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے ـــــ تم اپنی اصلاح کی کوشش کیوں نہیں کرتے لوگ تمہیں اوّل درجے کا آوارہ گرد سمجھتے ہیں۔تم ان کے دماغ سے یہ خیال دور کیوں نہیں کرتے ـــــ تم کیوں اتنے بے پرواہ ہو ـــــ کیا تمہارا یہ لاابالی پن کبھی دور نہیں ہوگا ـــــ کیا تم کبھی انسان نہیں بنو گے ؟

جگل :- آہستہ۔آہستہ

شیلا :- لوگ میری جان کھا گئے ہیں۔جدھر جاتی ہوں میری طرف انگلیاں اٹھتی ہیں ـــــ میرے کیرکٹر پر حملے کئے جاتے ہیں ـــــ میں سب کچھ سہتی ہوں صرف تمہاری خاطر۔

جگل :- میری خاطر۔

شیلا :- بھگوان جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تم سے اتنا اُنس کیوں پیدا ہو گیا ہے ـــــ میں تم سے بالکل کنارہ کش ہو جاتی۔تمہارے خیال تک کو

اپنے دل و دماغ سے محو کر دیتی مگر مجھے ترس آتا ہے کہ تم اور بھی زیادہ بہک جاؤ گے۔

جگل :- تم مجھ پر ترس کھاتی ہو ـــــ میں کوئی زخمی گدھا نہیں۔ کوئی لنگڑا کتا نہیں ـــــ کوئی بیمار بھینس نہیں۔

شیلا :- (ذرا درشتی کے ساتھ) جگل

جگل :- بکو نہیں۔

شیلا :- (دھیمے لہجے میں۔ افسردگی کے ساتھ) جگل

جگل :- جگل اول درجے کا بدمعاش۔ شہدا۔ لُچّا اور آوارہ گرد ہے

شیلا :- میں نے یہ کبھی نہیں سمجھا۔

جگل :- وہ اپنے بالوں میں تیل نہیں لگاتا۔ میلے کپڑے پہنتا ہے۔ اس کا جوتا پھٹا ہوا ہے۔

شیلا :- میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔

جگل :- پہلے نہیں کہا تو اب کہہ لو۔ ـــــ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرو ـــــ ابھی اسی وقت ـــــ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری عقل درست ہو جائے اور وہ رتّی بھر اُنس جو تمہارے دل میں پیدا ہو گیا ہے دور ہو جائے تم مجھ سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ تاکہ میں اور زیادہ بہک سکوں۔

شیلا :- تم کتنے بے رحم ہو

جگل :- لوگ تمہاری جان کھا گئے ہیں۔ جدھر جاتی ہو تمہاری طرف انگلیاں اُٹھتی ہیں۔ تمہارے کیرکٹر پہ حملے کئے جاتے ہیں ـــــ صرف میری خاطر ـــــ

مجھ شہدے لُچّے اور آوارہ گرد کی خاطر —— تمہارا فیصلہ اب مجھے منظور ہے اس لئے کہ تم مجھ پر بے کار ترس کھاتی رہی ہو —— طبیعت پر جبر کر کے مجھ پر رحم کرتی رہی ہو۔

شیلا:۔ تم بہت جلد بھڑک اُٹھے ہو جگل۔ مجھے تم سے جھوٹ موٹ کا اُنس نہیں ہے —— میری ہمدردی مصنوعی ہمدردی نہیں ہے —— میں تم پر ترس کھاتی ہوں اس لئے کہ دوسرے تم پر ترس نہیں کھاتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اور زیادہ بہک جاؤ۔ تمہارا وجود بالکل منتشر ہو جائے۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس طور پر کہ تم پھر انہیں اکٹھا بھی نہ کر سکو —— میں یہ نہیں چاہتی مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں عورت ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سلامت رہو۔ وہ تمام خوبیاں جو لوگوں کے نزدیک تمہارے اندر نہیں پیدا ہو جائیں —— میں بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکوں —— جگل صاحب میرے دوست ہیں۔

جگل:۔ (تمسخر آمیز ہنسی) جگل صاحب —— یہ جگل صاحب ہیں شہر کے بہت بڑے رئیس —— بہت بڑا نام ہے آپ کا۔ آپ کی پتلون میں چار پیوند لگے ہیں کوٹ آپ نے کسی دوست کا پہن رکھا ہے۔ جوتا آپکا پھٹا ہوا ہے (ہنستا ہے) یہ جگل صاحب ہیں (ہنستا ہے) جاؤ شیلا جاؤ —— ایک ناکارہ آدمی میں اتنی دلچسپی نہ لو —— پڑھو۔ امتحان پاس کرو اور شادی وادی کر کے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ جاؤ۔

شادی وادی کے ساتھ ہی شہنائیوں کا رکارڈ لگا دیا جائے

تھوڑی دیر کے بعد ہجوم کا شور پیدا کیا جائے ـــــ چند لمحات کے بعد ان آوازوں کو دھیما کر دیا جائے اور ذیل کا مکالمہ سپرد میوزیم کیا جائے۔

ایک آدمی :- کیا ہو رہا ہے بھائی یہاں ؟

دوسرا آدمی :- شادی بیاہ ہو رہا ہے۔

جگل :- کس کا

پہلا آدمی :- تم جانتے ہو۔

جگل :- مجھے کیا معلوم

پہلا آدمی :- رائے بہادر شیام سندر جی کی پُتری شیلا کا بیاہ ہو رہا ہے

جگل :- کس کے ساتھ

پہلا آدمی :- رائے صاحب لالہ گنیش پرشاد جی کے ساتھ ـــــ شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔

جگل :- ضرور کھیلتے ہوں گے ـــــ سگرٹ کا ایک کش مجھے بھی دینا۔

پہلا آدمی :- نیا لے لو۔

جگل :- نہیں نہیں۔ یہی دو ـــــ تم نیا سُلگا لو (ہنستا ہے) سُلگے سلگائے سگرٹ مجھے اچھے لگتے ہیں اس لئے کہ سلگانے نہیں پڑتے۔

(شہنائیوں کی آواز بلند ہو کر پھر عقب میں چلی جائے۔)

جگل :- بڑا جمگھٹ لگا ہے۔

پہلا آدمی :- براوت آچکی ہے

جگل ۔ چلی بھی جائے گی۔

پہلا آدمی :۔ (ہنستا ہے) تو کیا یہیں بیٹھی رہے گی ــــــ کیسی باتیں کرتے ہو یار۔

جگل :۔ (ہنستا ہے) بس ایسی باتیں ہی کیا کرتا ہوں۔

دوسرا آدمی :۔ یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟

جگل :۔ جانے بلا۔

پہلا آدمی :۔ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔

جگل :۔ میری طرف ..... ؟ (ہنستا ہے) لیکن میں تو شادی نہیں کرنا چاہتا۔

(تینوں ہنستے ہیں)

لڑکی :۔ آپ میں سے کس کا نام جگل ہے۔

پہلا آدمی :۔ میرا تو نہیں ہے اس سے پوچھ لو۔

لڑکی :۔ (جگل سے) کیا جگل صاحب آپ ہیں۔

جگل :۔ صاحب کوئی اور ہوگا۔ میں صرف جگل ہوں۔

لڑکی :۔ چلئے ــــــ آپ کو اندر بلایا ہے۔

جگل :۔ کس نے؟

لڑکی :۔ آپ چلئے میں بتاتی ہوں۔

جگل :۔ کیا میرا چلنا ضروری ہے

لڑکی :۔ جی ہاں۔

جگل :۔ (اپنے ساتھیوں سے) اچھا بھئی رخصت چاہتا ہوں۔ سگریٹ کا شکریہ۔

پہلا آدمی :۔ (ازراہ مذاق) ایک اور لیتے جاؤ۔ شاید اندر ضرورت پڑے۔

جگل :۔ (ہنستا ہے) نہیں پڑے گی۔

شہنائیوں اور ہجوم کا شور عقب سے ابھر آئے اور چند لمحات کے بعد دب جائے۔

جگل :۔ آپ نے مجھے بلایا ــــــ فرمایئے؟
شیلا :۔ (اضطراب بھرے لہجے میں) تم نے مجھے آپ کیوں کہا؟
جگل :۔ دیر کے بعد ملاقات ہوئی اس لئے یہ اجنبیت پیدا ہوگئی۔
شیلا :۔ تم ابھی تک ویسے کے ویسے ہو۔
جگل :۔ جی ہاں ابھی تک ویسے کا ویسا ہوں۔ کیا جناب کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟
شیلا :۔ (اور زیادہ مضطرب ہو کر) یہ آداب کس لئے۔
جگل :۔ آپ کے شاندار لباس سے مرعوب ہو گیا ہوں۔
شیلا :۔ (تنگ آکر) آہ۔ تم مجھے دیوانہ بنا دو گے۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا تھا کہ میں تم سے بے شمار باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اب مجھے ایک بھی یاد نہیں آتی۔ تمہارے اس عجیب و غریب لہجے نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے ــــــ بتاؤ مجھے کیا کہنا تھا؟
جگل :۔ مجھے کیا معلوم؟
شیلا :۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ تم سب کچھ جانتے ہو ــــــ جلدی کرو۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ بتاؤ ــــــ بتاؤ۔ میں تم سے کیا کہنا چاہتی تھی ــــــ بتاتے کیوں نہیں؟

جگل :۔ مجھے کیا معلوم۔

شیلا :۔ تم ــــ تم ــــ تمہاری صحت کیسی ہے؟ ــــ تم بہت دبلے ہو گئے ہو ــــ یں، یں بالکل اچھی ہوں۔ لیکن تم ــــ (تنگ آ کر) نہیں ــــ میں کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی (باہر سے کسی عورت کی آواز آتی ہے، شیلا)..... دیکھا ــــ وقت ہو گیا ــــ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا ــــ اور مجھے بے شمار باتیں کہنا تھیں۔

جگل :۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے

شیلا :۔ ہاں ــــ ہاں ــــ مجھے تم سے یہ بھی کہنا تھا۔

(دستک ہوتی ہے)

شیلا :۔ (بلند آواز میں) ٹھیرو..... (جگل سے) کچھ اور بھی کہو۔

جگل :۔ کیا کہوں!

(دستک ہوتی ہے)

شیلا :۔ آئی ــــ توبہ۔ دستک دے دے کر دروازہ توڑ دیا ہے (جگل سے) جگل اب تم جاؤ۔ کیا کروں مجبوری ہے ــــ لیکن دیکھو کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لئے ضرور آیا کرنا ــــ ضرور ــــ ضرور ــــ ادھر سے.....

(دروازہ کھولنے کی آواز)

شیلا :۔ مجھے بھولنا مت ــــ سنتے ہو۔ مجھے بھول نہ جانا۔

شہنائیوں اور ہجوم کی آواز ابھر کر اونچی ہو جاتی ہے۔ چند لمحات کے بعد فیڈ آوٹ۔

گنیش :۔ شیلا

شیلا :۔ جی

گنیش :۔ تمہارے البم میں یہ تصویر کس کی ہے۔

شیلا :۔ ٹھیریئے۔ میں آکے بتاتی ہوں۔

(قدموں کی آواز)

شیلا :۔ یہ ؟

گنیش :۔ کس کی ہے ؟

شیلا :۔ جگل صاحب کی۔

گنیش :۔ وہ کون

شیلا :۔ آپ نہیں جانتے ـــــ کالج میں یہ ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

گنیش :۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔

شیلا :۔ دیکھا ہوگا۔

گنیش :۔ ہوسکتا ہے مگر میں نے اُسے اچھی طرح دیکھا تھا اس لئے کہ اس کا لباس اور اس کی وضع قطع ....

(گھڑی چار بجاتی ہے)

شیلا :۔ لیجئے چار بج گئے ـــــ اب کیا خاک تیاری ہوگی مجھ سے اور ہمیں ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچنا ہے ـــــ البم کو چھوڑیئے اور موٹر نکلوانے کیلئے کہیئے

گنیش :۔ تمہیں ساڑھی تبدیل کرنا تھی۔

شیلا :۔ یہی ٹھیک ہے ـــــ ساڑھی تبدیل کرونگی تو ساری چیزیں بدلنا

پڑینگی ـــــ نیا بلاوز ـــــ نیا پیٹی کوٹ اور پھر یہ سینڈل بھی تو۔
اُتارنا پڑیگی ـــــ ہی ٹھیک ہے۔

گنیش :۔ لیکن اتنی جلدی کیا ہے۔

شیلا :۔ واہ ـــــ مجھے راستے میں اپنی ایک دو سہیلیوں سے بھی تو ملنا ہے
چلئے ـــــ چلئے۔

(قدموں کی چاپ۔ بعد میں موٹر کی آواز)

ایک دم ہجوم کا شور سنائی دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ لڑ جھگڑ رہے ہیں
شور کے اس ٹکڑے پر ذیل کا مکالمہ سُپرامپوز کیا جائے۔

دکاندار :۔ نہیں صاحب میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایسے ہزاروں گھسّے
مجھے دے چکا ہے۔

ایک آدمی :۔ ایک بار اور دیکھ لو۔

دکاندار :۔ کیا دیکھ لوں ـــــ اب کا گیا چھ مہینے اپنی شکل نہیں دکھائے گا
یہ تو اتفاق سے میری نظر پڑ گئی ورنہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔

دوسرا آدمی :۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو۔

دکاندار :۔ پکڑ کر تھانے میں لیجاؤں گا اور کیا کھڑا سالے کا منہ دیکھتا رہونگا

(موٹر کے ہارن کی آواز)

دکاندار :۔ آپ لوگ جائیے ـــــ کیا کوئی تماشہ ہے۔

تیسرا آدمی :- تماشا ہی تو ہے۔ تم اس سے اپنے روپے مانگتے ہو، یہ کہتا ہے میرے پاس نہیں۔ تم کہتے ہو۔ نہیں میں نہیں مانتا۔ تمہارے پاس ہوں نہ ہوں ابھی نکال کر دو۔

(بہت سے آدمی ہنستے ہیں)

دکاندار :- تو کیا کروں —— پھر بھاگ جائے گا —— کیا ساری عمر اسی کو ڈھونڈتا رہوں گا۔

پہلا آدمی :- ارے بھائی تم نے کیوں قرض لیا تھا۔ اب دیکھو کتنی خفّت اُٹھانی پڑ رہی ہے تمہیں۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

دوسرا آدمی :- بھئی راستہ سے تو ہٹ جاؤ۔

دکاندار :- آپ لوگ ہٹ جائیں میں تو یہیں کھڑا رہوں گا۔ اس کا گریبان پکڑے

تیسرا آدمی :- یہ کیسا آدمی ہے خود کچھ بولتا ہی نہیں۔

دکاندار :- کیا بولے گا —— روپیہ دینا ہے اور ہر حالت میں دینا ہے

(موٹر کے ہارن کی آواز۔ بالکل قریب)

گنیش :- راستے سے ہٹو گے یا موٹر اوپر چڑھا دوں —— بازار کے عین بیچ میں تماشا لگا رکھا ہے۔

(ہجوم کا شور)

شیلا :- (گھبرا کر) چلئے اب راستہ صاف ہو گیا۔

گنیش :- ٹھہرو...... (بلند آواز میں) اے —— ذرا اِدھر آؤ

دکاندار :- مجھے بلایا ہے سیٹھ صاحب؟

گنیش :- کیا بات ہے؟

دکاندار :- روپیہ لینا ہے سیٹھ صاحب - چھ مہینے ہوگئے ہیں - برابر مجھے گھسیٹے دیئے چلا جا رہا ہے - آج دیتا ہوں - کل دیتا ہوں - بس اس طرح چھ مہینے گزر گئے ہیں -

گنیش :- کتنی رقم نکلتی ہے تمہاری اس کی طرف

دکاندار :- سوا نو روپے

گنیش :- بس ...... (وقفہ) لو یہ دس روپیہ کا نوٹ -

شیلا :- (اضطراب کے لہجے میں) آپ کیوں کسی کا قرض ادا کرتے ہیں وہ خود ادا کرے -

گنیش :- کہاں سے ادا کرے گا ... (دکاندار سے) سوا نو روپے کہے تھے نا تم نے

دکاندار :- جی ہاں

گنیش :- بارہ آنے بچیں گے - یہ تم اُسے دے دینا -

شیلا :- (قریب قریب چیخ کر) آپ نوٹ واپس لیجئے ـــــ آپ بردستی بھیک دے رہے ہیں ......

موٹر اسٹارٹ ہوتی ہے اور چل پڑتی ہے)

پہلا آدمی :- یہ کون تھے؟

جگل :- (زہر خند کے ساتھ) تم نہیں جانتے یہ کون تھے ـــــ یہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے - رائے صاحب لالہ گنیش پرشاد ـــــ لاکھوں میں کھیلتے

ہیں ـــــ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ ان کی پتلون میں ایک بھی پیوند نہیں تھا۔ کوٹ ان کا اپنا تھا ـــــ جو تا بالکل نیا تھا......

دکاندار :۔ لو یہ بارہ آنے

جنگل :۔ لاؤ ـــــ میری جیب بالکل خالی تھی۔

(ہجوم کا شور ـــــ چند لمحات کے بعد فیڈ آپ)

آہستہ آہستہ ذیل کی غزل کی دھن شروع ہو ـــــ سازوں پر چند شعر گائے جائیں۔

غزل

غم کی دُنیا بسا رہی ہوں میں
اُن کو اپنا بنا رہی ہوں میں
سازِ ہستی کے تار ٹوٹ نہ جائیں
نغمۂ دل سُنا رہی ہوں میں
سعیٔ ناکام کے چراغوں کو
آندھیوں میں جلا رہی ہوں میں (پرویز)

(چند لمحات تک ساز دردناک لے میں بجتے رہیں)

گنیش :۔ شیلا

شیلا :۔ (فرنیفتگی کے ساتھ) جی

گنیش :۔ تمہارے البم سے وہ تصویر کہاں گئی۔

شیلا :- وہ جو آپ نے اس روز دیکھی تھی۔
گنیش :- ہاں وہی
شیلا :- نکال دی ہے
گنیش :- کیوں.... بڑی اچھی تصویر تھی۔
شیلا :- (لہجے میں دبے ہوئے صدمے کے آثار نظر آتے ہیں) اچھی ہی تھی۔
گنیش :- تو نکال کیوں پھینکی۔
شیلا :- نکالی ہے پھینکی نہیں۔
گنیش :- میرا مطلب یہی تھا۔
شیلا :- اچھا
گنیش :- تمہاری طبیعت کئی دنوں سے سُست سی ہے ـــــ غالباً اُسی دن سے جب ہم موٹر میں باہر گئے تھے۔
شیلا :- جی ہاں - اُسی دن سے سُست ہے ہوا لگ گئی تھی۔
گنیش :- مجھے یاد آیا - اُس روز واقعی ہوا بہت تیز تھی۔
شیلا :- سرد بھی۔
گنیش :- سرد بھی.... یہ ہوا بعض اوقات بہت تیز اور سرد ہو جاتی ہے۔
شیلا :- جی ہاں
گنیش :- شیلا اپنے اس دوست کی کچھ باتیں تو سناؤ - تمہاری طبیعت بہل جائیگی۔
شیلا :- کیا سناؤں۔
گنیش :- کچھ بھی ـــــ تصویر سے آدمی دلچسپ معلوم ہوتا تھا ـــــ کیا نام بتایا تھا

شیلا :- جگل صاحب

گنیش :- جگل صاحب (صاحب پر زور دیکر) آپ کی کوئی خاص خوبی۔

شیلا :- آوارہ مزاجی۔

گنیش :- (ہنستا ہے) مذاق کرتی ہو۔

شیلا :- (انتہائی سنجیدگی کے ساتھ) مذاق نہیں کرتی۔ جگل صاحب کی سب سے بڑی خوبی اُن کی آوارہ مزاجی ہے۔ ان کا لاابالی پن۔

گنیش :- تو وہ ایک نہیں کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔

شیلا :- جی ہاں ——— وہ بیحد مفلس ——— انتہا درجے کے غلاظت پسند بدتمیز ادب آداب سے ناواقف (آواز گلوگیر ہو جاتی ہے) بدزبان اور ذلت پسند ہیا

گنیش :- تم صریحاً مذاق کر رہی ہو۔ میں ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں۔

شیلا :- (تلخ لہجے میں) مذاق آپ کر رہے ہیں۔

گنیش :- تمہاری سالگرہ کی خوشی میں آج شام کو ایک دعوت کر رہا ہوں۔ تم جگل صاحب کو بلاؤ۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔

شیلا :- (ایک دم بھڑک اٹھتی ہے) بس۔ بس ——— اب آپ میری آتما کو دکھ نہ دیجئے بہت زہریلی سوئیاں آپ مجھے چبھو چکے...... (روتی آواز میں) تجا بھر کے آپ نے مجھے ذلیل کر لیا ——— کیا ابھی تک کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ ...... جو کچھ آپ چاہتے تھے میں نے کہہ دیا ہے ——— آپ نے کہلوا لیا ——— اب آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ بدمعاش ہے۔ لچا ہے۔ آوارہ گرد ہے ——— انسانیت کے دامن پر بدنما دھبہ ہے ——— قابل نفرت

انسان ہے ——— بہ کچھ اور کہوں یا اتنا ہی کافی ہے ......

گنیش :۔ (بچے تلے انداز میں) اتنا کافی نہیں ہے۔ آج شام کو وہ دعوت میں ضرور شریک ہونگے۔

شیلا :۔ میں اسے ہرگز نہیں بلاؤں گی۔

گنیش :۔ مجھے معلوم تھا۔ اس لئے میں نے خود اُن سے آنے کو کہا اور انہوں نے کمال عنایت سے میری درخواست قبول کرلی۔

شیلا :۔ (سخت گھبراہٹ کے ساتھ) وہ آئے گا ——— نہیں نہیں ——— وہ کبھی نہیں آئے گا ——— اگر وہ آئے گا تو آپ مجھے موجود نہ پائیے گا۔

گنیش :۔ میں اس کا انتظام بھی کرلوں گا (ہنستا ہے) ...... آج شام کو پانچ بجے تم دونوں دعوت میں شریک ہو گے۔

(گھڑیال کے الارم کی خرخراہٹ۔ پانچ بجنے کی آواز اور ساتھ ہی ہجوم کا شور۔)

ایک مہمان :۔ رائے صاحب بڑے ٹھاٹ کی دعوت کی ہے۔

گنیش :۔ لالہ جی شیلا کی سالگرہ ہو اور یہ ٹھاٹ نہ کئے جائیں (مسکرا کر) کیوں شیلا؟

شیلا :۔ اتنا اہتمام صرف آپ ہی کر سکتے تھے۔

گنیش :۔ (مسکرا کر) صرف تمہاری خاطر؟

دوسرا مہمان :۔ رائے صاحب ——— اب کس کا انتظار ہے دعوت شروع ہو۔

گنیش :۔ سب مہمان آچکے ہیں سوائے ایک کے۔ ان کے بغیر پروگرام شروع

نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مہمان :- کون ہیں یہ مہاشے ؟

گنیش :- شیلا کے کالج کے زمانے کے دوست ـــــ جگل صاحب ابھی تک آئے نہیں شیلا؟

شیلا :- آ ہی جائیں گے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

تیسرا مہمان :- یہ کون آیا ؟

دوسرا مہمان :- آگے بڑھ کے دیکھ لو۔

(قدموں کی آواز)

تیسرا مہمان :- بڑی شاندار موٹر ہے۔

چوتھا :- بالکل نیا ماڈل ہے۔

تیسرا مہمان :- آج کل تو بہت زیادہ قیمت ہو گی اسکی۔

(قدموں کی آواز)

رامو :- سرکار۔ جگل صاحب تشریف لائے ہیں۔

گنیش :- آ گئے۔

رامو :- ہاں سرکار آ گئے۔

گنیش :- اُنہیں اندر لے آؤ ۔ رامو۔

(قدموں کی آواز۔ مائکروفون کی طرف)

گنیش :- (حیرت کے ساتھ) یہ کون ہے ؟

(قدموں کی آواز قریب تر آجاتی ہے)

جگل :- (باوقار، شگفتہ اور باتمیز لہجے میں) اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ میں سے کون صاحبِ خانہ ہیں۔

شیلا :- جگل ...... تم ...... تم ......؟

جگل :- اوہ ... شیلا ..... بھئی پہلے مجھے اپنے پتی سے متعارف کراؤ جنہوں نے مجھے یہاں مدعو کیا۔

گنیش :- ..... میں حاضر ہوں۔

جگل :- پہلے آپ میرا شکریہ قبول کیجیے کہ آپ نے مجھے اس شاندار دعوت میں شریک کیا۔ آپ نے جو آدمی میرے پاس بھیجا تھا میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ بے حد مصروف ہونے کے باوجود میں ضرور آؤں گا ـــــ شیلا تمہارے رائے صاحب بڑے ہی اچھے آدمی ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو ـــــ کیوں جناب میں غلط کہہ رہا ہوں۔

گنیش :- (چونک کر) کیا کہا آپ نے

جگل :- (ہنستا ہے) حد ہو گئی ہے ـــــ شیلا مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے ـــــ دراصل۔ جائداد کے انتظام اور دوسرے کاموں میں اس قدر مشغول ہوا کہ سب کچھ بھول گیا (ہنستا ہے) دولت کمانا اور اس کو سنبھالنا بہت بڑی دردسری ہے ـــــ تمہاری صحت تو اب اچھی ہے

شیلا :- (خاموش رہتی ہے)

جگل :- رائے صاحب۔ یہ آپ نے شیلا کو کیا کر دیا ہے۔ کچھ بولتی ہی نہیں ـــــ

بالکل گونگی ہوگئی ہے ـــــ اور آپ ......

گنیش :- میں ـــــ میں .....!

جگل :- جی ہاں آپ کیا سوچ رہے ہیں ـــــ ذرا ہنگامہ شروع ہو ـــ میرے پاس وقت بہت کم ہے جو پروگرام آپ نے بنایا ہے بس اب شروع ہو جائے ـــــ ہاں بھئی شیلا ـــــ میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔

شیلا :- (مردہ آواز میں) تحفہ

جگل :- میرا خیال ہے کہ میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں ـــــ ارے صاحب آپ پروگرام شروع نہیں کرتے ـــــ اب دیر کیا ہے۔

(مکمل خاموشی)

جگل :- یہ خاموشی کیوں؟

(وقفہ)

جگل :- آپ نہیں شروع کرتے تو لیجئے۔ میں شروع کرتا ہوں (بلند آواز میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے) حضرات سنیئے!

(ہجوم کی سرگوشیاں)

جگل :- (تقریر کے انداز میں) اے صاحب لالہ گنیش پرشاد جی نے آپکو ایک بندر کا تماشا دکھانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بندر نہیں آیا ـــــ اس کے بدلے میں آگیا ......

(ہجوم کی سرگوشیاں)

جگل :- جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں بندر نہیں ہوں۔ خوش پوش انسان ہوں

آپ نے میرا لباس یقیناً پسند کیا ہوگا۔ وہ موٹر کار بھی پسند کی ہوگی جو ابھی تک باہر کھڑی ہے ——— میری گفتگو آپ کو ضرور بھاتی ہوگی ...... یہ میری سونے کی گھڑی ...... یہ ہیرے کی انگوٹھی بہت قیمتی ہے ——— لیکن آپ کی نگاہوں نے تو میری ہر چیز کو تول لیا ہوگا اور اسکی قیمت بھی مقرر کرلی ہوگی (لہجے میں طنز پیدا ہوجاتا ہے) آپ سب شریف آدمی ہیں ... میں ——— میں بھی شریف آدمی ہوں۔ اس لئے کہ میرا لباس اچھا ہے۔ میری موٹر اچھی ہے میری انگوٹھی اچھی ہے۔

گنیش :۔ مسٹر جگل۔

جگل :۔ خاموش رائے صاحب خاموش۔ جب ایک شریف آدمی بات کر رہا ہو تو اُسے بیچ میں نہیں ٹوکنا چاہیئے ——— یہ گنوارپن ہے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ مجھے ایک بہت ضروری کام پر جانا ہے میں آوارہ گرد۔ لچا۔ بدمعاش اور رزیل انسان نہیں ہوں اسلئے کہ میں مفلس نہیں ہیں۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے (ہنستا ہے) بیشمار دولت اتنی کہ مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی ——— دولت بڑی اچھی چیز ہے یہ نہ ہو تو آپ کیا ہیں ...... محض بندر۔

(ہجوم کا شور)

جگل :۔ خاموش ..... اگر دولت نہ ہوتی تو آپ سب بندر ہوتے۔ لوگ ڈگڈگیاں بجاکر آپ کو نچاتے ——— آپ کے دماغوں میں بھس بھرا ہے لیکن آپ عقل مند ہیں۔ صرف دولت کیوجہ سے ——— آپ بدشکل ہیں۔ آپکی

توندیں ابھری ہوئی ہیں لیکن آپ خوبصورت ہیں۔ خوبصورت بیویوں کے شوہر ہیں اسلئے کہ آپ دولتمند ہیں ـــــ آپ بھری محفل میں ڈکاریں لیں میز پر ننگی ٹانگیں رکھ کر بیٹھ جائیں جمائیوں پر جمائیاں لیں لیکن آپ کو کوئی بدتمیز نہیں کہے گا ـــــ آپ بڈھے ہو کر جوان ہوسکتے ہیں لیکن جن کے پاس دولت نہیں وہ جوانی میں بھی جوان نہیں ہوسکتے ـــــ دولت عجیب و غریب چیز ہے

آپ اپنی منحوس اور بھیانک شکل کی تعریف میں شاعروں سے قصیدے لکھوا سکتے ہیں ـــــ بڑے بڑے آرٹسٹوں سے اپنی تصویر کھچوا سکتے ہیں خوبصورت عورتوں سے رومان لڑا سکتے ہیں ـــــ دولت عجیب و غریب چیز ہے (ہنستا ہے) دولت عجیب و غریب چیز ہے (ہنستا ہے) میں بھی دولتمند ہوں ـــــ بڑا دولتمند (دیوانہ وار ہنستا ہے ـــــ ہنستے ہنستے آخر میں آواز بالکل کمزور مردہ ہوجاتی ہے) بہت بڑا دولتمند

شیلا :- (ایکدم چیخ کر) جگل ...... جگل۔

(جگل کے گرنے کی آواز۔ ہجوم کا شور)

شیلا :- (بھاگ کر جگل کے پاس جاتی ہے) جگل ـــــ جگل ـــــ یہ کیا ہوگیا تمہیں ـــــ گر کیوں پڑے ـــــ سنتے ہو؟

جگل :- (کمزور آواز میں کمزور ہنسی کے ساتھ) میں بہت بڑا دولتمند ہوں بہت بڑا ـــــ آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا اور دو مہینے سے بیمار ہوں ـــــ رائے صاحب آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا کہاں ہیں رائے صاحب

شیلا :- (گلوگیر آواز میں) جگل . . . .

جنگل :۔ شیلا ۔ جنگل نہیں ۔ جنگل صاحب کہو ـــــ ان لوگوں سے فخر کے ساتھ کہو جنگل صاحب ہیں ـــــ میرے دوست ـــــ انکی پتلون اپنی نہیں ۔ کوٹ قمیص ۔ ٹائی ۔ جوتا ۔ انگوٹھی ۔ گھڑی ـــــ ان میں سے کوئی چیز بھی اُنکی اپنی نہیں ـــــ یہ سب چیزیں اُنکی ہیں جو نیچے اپنی موٹر میں میرا لباس پہنے بندھا پڑا ہے ۔ جانے کون گدھا ہے ـــــ لیکن ہے دولتمند (ہنستا ہے)

شیلا ۔ یہ تم نے کیا کیا جنگل ۔

جنگل ۔ (مسکراکر) ایک تماشے کے بدلے دوسرا تماشا ـــــ کیا میں اس لباس میں شریف اور مہذب انسان دکھائی نہیں دیتا ـــــ کیا ہوا جو مجھے آٹھ روز سے کھانے کو نہیں ملا ـــــ کیا ہوا اگر ضعف کے باعث میری زندگی ختم ہو رہی ہے ـــــ کیا ہوا ـــــ ایک آوارہ گرد کم ہو جائیگا ـــــ ایک ناکارہ اِنسان یہاں سے دفع ہو جائیگا... اچھا شیلا میں اب جاتا ہوں ۔

شیلا ۔ کہاں ۔

جنگل ۔ موت نے بلا بھیجا ہے ـــــ وہاں بھی شاید ایسی دعوت ہو گی ۔

شیلا ۔ (گلوگیر آواز میں) میرا تحفہ ۔

جنگل ۔ تمہارا تحفہ ـــــ ہاں تمہارا تحفہ ـــــ میرا سب کچھ تو نیچے موٹر میں پڑا ہے (وقفہ) تمہارے اِس نوکر کا کیا نام ہے ۔

شیلا ۔ رامو ۔

جنگل ۔ رامو ۔ ذرا آگے آؤ ـــــ آجاؤ ۔ ڈرو نہیں ۔

(وقفہ)

جگل - اس کی آنکھوں میں تمہیں دو میلے آنسو نظر آرہے ہیں ؟

شیلا - آرہے ہیں۔

جگل - یہی آنسو میرا تحفہ ہیں جو یہاں اور کسی کی آنکھوں میں نظر نہیں آتے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے دی ہے —— رامو بیڑی ہے تمہارے پاس ؟

رامو - ہے سرکار۔

جگل - ایک سلگا کر مجھے دو۔

(ماچس کی کھڑکھڑاہٹ)

جگل - (بالکل دھیمے لہجے میں) آوارہ گرد —— لچا —— بدمعاش . . .

(آواز بالکل ڈوب جاتی ہے)

رامو - لیجئے سرکار بیڑی۔

جگل - (سرگوشی میں —— ہلکی سی ہنسی کے ساتھ) سرکار . . .

شیلا - (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے) جگل . . . جگل . .

(سسکیاں —— فیڈ آوٹ)

غسل خانہ

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس میں کبھی اُپلے اور لکڑیاں کوئلے رکھے جاتے تھے، مگر اب اس میں نل لگا کر اس کو مردانہ غسل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فرش وغیرہ مضبوط بنا دیا گیا ہے تاکہ مکان کی بنیادوں میں پانی نہ چلا جائے۔ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے جو گلی کی طرف کھلتی ہے۔ اس میں زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔

میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب یہ غسل خانہ میری زندگی میں داخل ہوا آپ کو حیرت ہوگی کہ غسل خانے انسانوں کی زندگی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں غسل خانہ تو ایسی چیز ہے جس میں آدمی داخل ہوتا ہے اور دیر تک داخل رہتا ہے۔ لیکن جب آپ میری کہانی سُن لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ غسل خانہ واقعی میری زندگی میں داخل ہوا اور اس کا ایک اہم ترین جزو بن کے رہ گیا۔

یوں تو میں اس غسلخانے سے اس وقت کا متعارف ہوں جب اس میں اُپلے وغیرہ پڑے رہتے تھے اور میری بلّی نے اس میں بھیگے ہوئے چوہوں کی شکل کے چار بچے دیئے تھے۔ ان کی آنکھیں دس بارہ روز تک مندی رہی تھیں چنانچہ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو اسکی آنکھیں کھلی دیکھ کر میں نے امّی جان سے کہا تھا۔ "امّی جان میری بلّی ٹیڈی نے جب بچے دئے تھے تو انکی آنکھیں بند تھیں اسکی کیوں کھلی ہوئی ہیں ؟"

یعنی میں بچپن ہی سے اس غسل خانے کو جانتا ہوں لیکن یہ میری زندگی میں اس وقت داخل ہوا۔ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ایک بھاری بھرکم بستہ بغل میں دبا کر ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے میں نے اسکول سے گھر آتے ہوئے سردار دوہا دا سنگھ پھل فروش کی دکان سے ایک کابلی انار چرایا۔ میں اور میرے دو ہم جماعت لڑکے ہر روز کچھ نہ کچھ اس دکان سے چرایا کرتے تھے لیکن بھائی دولا دا سنگھ جو پھلوں کے ٹوکروں میں گھرا ایک بڑی سی پگڑی اپنے کیسوں پر رکھے سارا دن افیم کے نشے میں اونگھتا رہتا تھا خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم بڑی بڑی چیزیں نہیں چراتے تھے۔ کبھی انگور کے چند دانے اُٹھائے کبھی لوکاٹ کا ایک گچھا لے اڑے۔ کبھی مٹھی بھر خوبانیاں اٹھائیں اور چلتے بنے۔ لیکن اس دفعہ چونکہ میں نے زیادتی کی تھی اس لئے پکڑا گیا۔ ایکدم بھائی دوہا دا سنگھ اپنی ابدی پینک سے چونکا اور اتنی پھرتی سے نیچے اُتر کر اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا کہ میں دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی میرے

حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے تو میں اس چوری کو کھیل سمجھا تھا لیکن جب میلی ڈاڑھی والے سردار ودہاوا سنگھ نے اپنی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھ سے میری گردن ناپی تو مجھے احساس ہوا کہ میں چور ہوں۔

بچپن ہی سے مجھے اس بات کا خیال رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے میری ذلت نہ ہو۔ چنانچہ بھرے بازار جب میں نے خود کو ذلیل ہوتے دیکھا تو فوراً بھائی ودہاوا سنگھ سے معافی مانگ لی۔ آدمی کا دل بہت اچھا تھا۔ انار میرے ہاتھ سے چھین کر اس نے وہ میل جو اس کے خیال کے مطابق انار کو لگ گیا تھا اپنے کرتے سے صاف کیا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا "وکیل صاحب آئے تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ کے لڑکے نے اب چوری شروع کر دی ہے"۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو سمجھا کہ سب بھوٹ گئے۔ وکیل صاحب یعنی میرے اباجی سردار ودہاوا سنگھ نہیں تھے۔ وہ نہ افیم کا نشہ کرتے تھے اور نہ انہیں پھلوں ہی سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس کمبخت ودہاوا سنگھ نے ان سے میری چوری کا ذکر کر دیا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی اُمّی جان سے کہیں گے "کچھ سنتی ہو۔ اب تمہارے اس برخوردار نے چوری چکاری بھی شروع کر دی ہے۔ سردار ودہاوا سنگھ نے جب مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب آپ کا لڑکا انار اُٹھا کے بھاگ گیا تھا تو خدا کی قسم میں شرم سے پانی پانی ہو گیا ۔۔۔ میں نے آج تک اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دی لیکن اس نالائق نے میری ساری عزّت خاک میں ملا دی ہے"۔

وہ مجھے دو تین طمانچے مار کر مطمئن ہو جاتے مگر اُمّی جان کا ناک میں دم کر دیتے۔

اس لئے کہ وہ ہماری طرف داری کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کی اولاد (ہم چھ بیٹے تھے) سے کوئی چھوٹی سی لغزش ہو اور وہ آنگن میں آ اپنے گنجے سر کا پسینہ پونچھ پونچھ کر امّی جان کو کوسنا شروع کر دیں جیسے سارا قصور ان کا ہے۔

کوسنے کے بعد بھی اُن کا جی ہلکا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے اور دیر تک خاموش آنگن میں کے سیمنٹ لگے فرش پر اِدھر اُدھر ٹہلتے رہتے تھے۔

جس وقت بھائی دو ہا وا سنگھ نے وکیل صاحب کا نام لیا میری آنکھوں کے سامنے اباجی کا گنجا سر آ گیا جس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں ان کو ہمیشہ غصے کے وقت اس جگہ پر پسینہ آتا ہے۔

بستہ میری بغل میں بہت وزنی ہو گیا۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ شرم کا وہ احساس جو چوری پکڑے جانے پر پیدا ہوا مٹ گیا اور اس کی جگہ ایک تکلیف دہ خوف نے لے لی۔ ابّا جی کا گنجا سر۔ اس پر چمکتی ہوئی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں۔ آنگن کا سیمنٹ لگا فرش۔ اس پر ان کا غصے میں اِدھر اُدھر چھیڑے ہوئے ببر شیر کی طرح چلنا اور رک رک کر امّی جان پر برسنا۔ . . . .

سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا غسل خانے کے پاس ٹھیر کر میں نے ایک بار سوچا کہ اگر اس کمبخت پھل فروش نے سچ مچ ابّا جی سے کہہ دیا تو آفت ہی آ جائے۔ دو تین روز کے لئے سارا گھر جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔ ابّا جی اور

سب کچھ معاف کر سکتے تھے۔ لیکن چوری کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ہمارے پرانے ملازم بنّو نے ایک بار دس روپے کا نوٹ اُمّی جان کے پان دان سے نکال لیا تھا۔ اُمّی جان نے تو اُسے معاف کر دیا تھا لیکن ابّا جی کو جب اِس چوری کا پتا چلا تو انھوں نے اُسے نکال باہر کیا "میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔"

اُن کے یہ الفاظ میرے کانوں میں کئی بار گونج چکے تھے میں نے اُوپر جانے کے لئے زینے پر قدم ہی رکھا کہ اُن کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ جانے وہ میرے بڑے بھائی ثقلین سے کیا کہہ رہے تھے لیکن میں یہی سمجھا کہ وہ بنّو کو گھر سے باہر نکال رہے ہیں اور اس سے غصّے میں یہ کہہ رہے ہیں "میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔"

میرے قدم منوں بھاری ہو گئے۔ میں اور زیادہ سہم گیا اور اوپر جانے کے بجائے نیچے اُتر آیا۔ خدا معلوم کیا جی میں آئی کہ غسل خانے کے اندر جا کر میں نے صدق دل سے دعا مانگی کہ ابّا جی کو میری چوری کا علم نہ ہو یعنی ودھاوا سنگھ اُن سے اس کا ذکر کرنا بھول جائے۔ دُعا مانگنے کے بعد میرے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ چنانچہ میں اُوپر چلا گیا۔

خدا نے میری دعا قبول کی۔ ودھاوا سنگھ اور اس کی دکان ابھی تک موجود ہے۔ لیکن اُس نے ابّا جی سے انار کی چوری کا ذکر نہیں کیا۔ غسل خانہ یہیں سے میری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

ایک بار پھر ایسی ہی بات ہوئی۔ میں زیادہ لُطف لینے کی خاطر پہلی دفعہ

بازار میں کھلے بندوں سگریٹ پئے جا رہا تھا کہ اباجی کے ایک دوست سے
میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے سگرٹ میرے ہاتھ سے چھین کر غصے میں
ایک طرف پھینک دیا اور کہا: "تم بہت آوارہ ہو گئے ہو۔ بڑوں کا
شرم و لحاظ اب تمہاری آنکھوں میں بالکل نہیں رہا۔ خواجہ صاحب
سے کہہ کر آج ہی تمہاری اچھی طرح گوشمالی کرادُوں گا۔"

انار کی چوری کے مقابلے میں کھلے بندوں سگریٹ پینا اور بھی
زیادہ خطرناک تھا۔ خواجہ صاحب یعنی میرے اباجی خود سگریٹ پیتے تھے
مگر اپنی اولاد کے لئے انھوں نے اس چیز کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے
رکھا تھا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی کی جیب میں سے انھیں سگرٹ
کی ڈبیا مل گئی تھی جس پر اُنھوں نے ایک تھپڑ لگا کر فیصلہ کن لہجے
میں یہ الفاظ کہے تھے: "ثقلین اگر میں نے تمہاری جیب میں پھر سگریٹ کی
ڈبیا دیکھی تو میں تمھیں اس روز گھر سے باہر نکال دونگا ــــ سمجھ گئے؟"

ثقلین سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہر روز صرف ایک سگریٹ لاتا تھا
اور پاخانے میں جا کر پیا کرتا تھا۔

میں ثقلین سے عمر میں تین برس چھوٹا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرا سگریٹ
پینا اور وہ بھی بازاروں میں کھلے بندوں ــــ اباجی کسی طرح بھی برداشت
نہ کرتے۔ ثقلین کو تو انھوں نے صرف دھمکی دی تھی مگر مجھے وہ یقیناً گھر
سے باہر نکال دیتے۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر صدقِ دل سے

دعا مانگی کہ اَے خدا اباجی کو میرے سگریٹ پینے کا کچھ علم نہ ہو۔ دُعا مانگنے کے بعد میرے دل پر سے خوف کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور میں اُوپر چلا گیا۔

آپ کہیں گے کہ میں خاص طور پر غسل خانے میں داخل ہو کر ہی کیوں دُعا مانگتا تھا۔ دعا کہیں بھی مانگی جا سکتی ہے۔ درست ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں دل میں اگر کوئی بات سوچوں تو اُس کے ساتھ اور بہت سی غیر ضروری باتیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ میں نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دعا مانگی تھی مگر میرے دل میں کئی اوٹ پٹانگ باتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دعا اور یہ باتیں غلط ملط ہو کر ایک بے ربط عبارت بن گئی تھی۔

"اللہ میاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے سگرٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیڑا غرق ایک پوری ڈبیا سگرٹوں کی میرے نیکر کی جیب میں پڑی ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لی تو کیا ہو گا ——— کہیں ثقلین ہی نہ لے اُڑے ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ میاں ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پینے میں کیا بُرائی ہے؟ اباجی نے چھٹی جماعت سے پینے شروع کئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ میاں ۔ ۔ ۔ ۔ سگرٹ والے کے ساڑھے تیرہ آنے میری طرف نکلتے ہیں۔ اِن کی ادائیگی کیسے ہو گی اور اسکول میں مٹھائی والے کے بھی چھ آنے دینا ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مٹھائی اکی بالکل واہیات ہے لیکن میں کھاتا کیوں ہوں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دے

...... جو سگریٹ ابا جی پیتے ہیں ان کا مزا کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔ — پان کھا کر سگریٹ پینے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے.... اللہ میاں ...... اب کے نہر پہ جائیں گے تو سگرٹوں کا ڈبہ ضرور خریدیں گے .... کب تک سگریٹ والا اُدھار دیتا جائے گا — اُمّی جان کا بٹوہ..... اللہ میاں مجھے معاف کر دے "

میں دل ہی دل میں خاموش دعا مانگوں تو یہی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے غسل خانے کے اندر جانا پڑتا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں وہاں اپنے خیالات کو آوارہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ میلی چھت کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ سانس روکا اور ہولے ہولے دعا گنگنانا شروع کر دی — عجیب بات ہے کہ جو دعا میں نے اِس غلیظ غسل خانے میں مانگی، قبول ہوئی۔ آنار کی چوری کا اباجی کو کچھ علم نہ ہوا۔ سگرٹ پینے کے متعلق بھی وہ کچھ جان نہ سکے اس لئے کہ اُن کا دوست اس روز شام کو کلکتے چلا گیا جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔

غسل خانے سے میرا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان دینے کے دوران میں دعا مانگی اور وہ قبول ہوئی۔ جیومیٹری کا پرچہ تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر تمام پرابوزیشن کتاب سے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیں اور دعا مانگی کہ کسی ممتحن کی نظر نہ پڑے اور میں اپنا کام اطمینان سے کر لوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے پھاڑے ہوئے اوراق نکال کر کاغذوں کے نیچے ڈسک پر

رکھ لئے اور اطمینان سے بیٹھا نقل کرتا رہا۔
ایک بار نہیں پچیسویں بار میں نے اِس غسل خانے میں حالات کی نزاکت محسوس کر کے دعا، مانگی جو قبول ہوئی۔ میرے بڑے بھائی ثقلین کو اس کا علم تھا مگر وہ میری ضعیف الاعتقادی سمجھتا تھا ــــــ بھئی کچھ بھی ہو۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس غسل خانے میں مانگی ہوئی دعا، کبھی خالی نہیں گئی۔ میں نے اور جگہ بھی دعائیں مانگ کر دیکھی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی قبول نہیں ہوئی ــــــ کیوں؟ ــــــ اس کا جواب نہ میں دے سکتا ہوں اور نہ میرا بڑا بھائی ثقلین ــــــ ممکن ہے آپ میں سے کوئی صاحب دے سکیں۔

چند برس پیچھے کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سُناتا ہوں۔ میرے چچا جان کی شادی تھی۔ آپ سنگاپور سے اس غرض کے لئے آئے تھے۔ چونکہ ان کا اور ہمارا گھر..... بالکل ساتھ ساتھ ہے اس لئے جتنی رونق ان کے مکان میں تھی اتنی ہی ہمارے مکان میں بھی تھی۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کہیئے کیونکہ لڑکی والے ہمارے گھر آگئے تھے آدھی آدھی رات ڈھولک کے گیت گائے جاتے تھے۔ ہونے والی دلہن سے چھیڑ چھاڑ۔ عجیب و غریب رسمیں۔ تیل۔ مہندی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ ــــــ بچوں کی چیخ و پکار۔ الہڑ لڑکیوں کی نئی گرگابیوں اور سینڈلوں میں ایک چلت پھرت ــــــ اوٹ پٹانگ

کھیل ـــــ غرض کہ ہر وقت ایک ہنگامہ مچا رہتا تھا۔

جب اس قسم کی خوشگوار افراتفری پھیلی ہو تو لڑکیوں کو چھیڑنے کا بہت لطف آتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ شادی بیاہ کے ایسے ہنگاموں ہی پر لڑکیوں کو چھیڑنے کا موقعہ ملتا ہے ـــ ہمارے دور کے رشتہ دار شالباف تھے۔ ان کی لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آ چکی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک رُکی ہوئی ہنسی ہے ـــــ نہیں۔ میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکا ـــــ اس کا سارا وجود کھلکھلا کر ہنس اٹھتا اگر اس کو ذرا سا چھیڑ دیا جاتا۔ بالکل ذرا سا یعنی اس کو اگر صرف چھو لیا جاتا تو بہت ممکن ہے وہ ہنسی کا فوارہ بن جاتی ـــــ اس کے ہونٹوں اور اسکی آنکھوں کے کونوں میں۔ اس کی ناک کے ننھے ننھے نتھنوں میں۔ اس کی پیشانی کی مصنوعی تیوریوں میں۔ اس کے کان کی لوؤں میں ہنسی کے ارادے مرتعش رہتے تھے ـــــ میں نے اس کے چھیڑنے کا پورا تہیہ کر لیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیڑھیوں کی بتی خراب ہو گئی۔ بلب فیوز ہوا یا کیا ہوا بہر حال اچھا ہوا کیونکہ وہ بار بار کبھی نیچے آتی تھی اور کبھی اوپر جاتی تھی۔ میں غسل خانے کے پاس اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا ـــــ وہ اوپر جاتی یا نیچے آتی مجھ سے اُسکی مڈبھیڑ ضرور ہوتی اور میں اندھیرے میں اس سے فائدہ اُٹھا کر اپنا کام کر جاتا ـــــ

بات معقول تھی چنانچہ میں کچھ دیر دم سادھے اُسکا منتظر رہا۔ اور اس دوران میں اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بناتا رہا۔

کسی کے نیچے اُترنے کی آواز آئی ـــــ کھٹ ـــ کھٹ۔ کھٹ . . . . میں تیار ہو گیا ـــــ اباجی تھے۔ انھوں نے پوچھا۔ کون ہے؟ ـــــ میں نے کہا "جی عباس" ـــــ اُنھوں نے اندھیرے میں ایک زور کا طمانچہ میرے مُنہ پر مارا اور کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہاں چھپ کر لڑکیوں کو چھیڑتے ہو۔ ثریا ابھی ابھی اپنی ایک سہیلی سے تمھاری اس بیہودہ حرکت کا ذکر کر رہی تھی۔ اگر اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ ـــــ واہیات کہیں کے! ـــــ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں اپنے بڑوں کی آبرو ہی کا کچھ لحاظ کرو۔ اور ثریا کی ماں نے آج ہی ثریا کے لئے تمہیں مانگا ہے ـــ لعنت ہو تم پر۔"

کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ کسی کے نیچے اُترنے کی آواز آئی۔ اباجی نے میرے حیرت زدہ مُنہ پر ایک اور طمانچہ رسید کیا اور بڑبڑاتے چلے گئے۔

کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ ثریا تھی ـــ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی اور حیا آلود غصّے کے ساتھ یہ کہتی چلی گئی۔

خبردار جو اب آپ نے مجھے چھیڑا۔ امّی جان سے کہہ دونگی۔

میں اور بھی زیادہ متحیر ہو گیا۔ دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں غسل خانے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور تقیّن باہر نکلا

میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

اس نے جواب دیا "دعا مانگ رہا تھا"

میں نے پوچھا "کس لئے؟"

مسکرا کر اس نے کہا "ثریا کو میں نے چھیڑا تھا"

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ اس غسل خانے میں جو دعا مانگی

جائے ضرور قبول ہوتی ہے۔

مت رہو بیٹھا اندر جا کر ۔ دیکھو گلی میں باہر آ کر

اڑتی اپنی سمت تتلی کی ۔

جیسے تتلی تیرے آنگن کی

Safwat Sheikh